مسئلہ اذان واقامت

ایک معتدل نظریہ

اصغر علی مصباحی

شاہ صفی اکیڈمی
SHAH SAFI ACADEMY
A centre for research on
Islamic Studies and Sufism

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسئلہ اذان واقامت

ایک معتدل نظریہ

اصغر علی مصباحی

شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد

سلسلۂ مطبوعات شاہ صفی اکیڈمی نمبر (۱۶)
©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب: مسئلۂ اذان واقامت: ایک معتدل نظریہ
بقلم: اصغر علی مصباحی
سال اشاعت: ۱۴۳۸ھ/ ۲۰۱۷ء
قیمت: ۸۰/روپئے
ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، الہٰ آباد

MASA'LA-E-AZAN - O- EQAMAT
By. **Asghar Ali Misbahi**
Published by. **Shah Safi Academy**, Khanqah Arifa
Saiyed Sarawan, Allahabad U.P. (India) 212213
Web: www.shahsafimemorialtrust.com
E-mail: shahsafiacademy@gmail.com



انتساب

خلیفہ راشد، ذوالنورین، امیر المومنین

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

(۴۷ق،ھ-۳۵ھ/۵۷۶-۶۵۶ء)

کے نام

جنھوں نے مقاصد شرع کے پیش نظر جمعہ کے لیے مزید ایک اذان کا اضافہ کیا

اور

ان تمام عثمانیوں کے نام جو مقاصد شریعت کو سمجھنا چاہتے ہیں

فہرست

پیش لفظ

مولانا ابوسعد حسن صفوی

فقہی اختلاف امت کے لیے زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فرمان عالی شان اِخْتِلَافُ أُمَّتِی رَحْمَةٌ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔) میں اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔خود عہد صحابہ،تابعین و تبع تابعین،ائمہ مجتہدین بلکہ ہر دور میں اصحاب علم کا علمی و فرعی اختلاف اس حقیقت پر شاہد عدل ہے۔ یہ اختلاف امت کے لیے یسر و آسانی کا نوید جاں فزا ہوتا ہے،اختلاف ہونا خلاف فطرت امر نہیں لیکن اختلاف کو قبول نہ کر کے مخالفت پر آمادہ ہونا یہ ضرور افسوسناک ہے۔

مسئلہ اقامت احکام فقہیہ کا ایک فرعی مسئلہ ہے۔فقہائے احناف کے یہاں اس کی تین صورتیں ہیں:

۱۔پہلی صورت یہ ہے کہ امام،صفوں کی طرف سے مسجد میں داخل ہو،اس کا حکم یہ ہے کہ جس جس صف سے امام گزرتا جائے،اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں۔

۲۔دوسری صورت یہ ہے کہ امام،اقامت کے وقت محراب کی جانب سے مسجد میں داخل ہو،اس کا حکم یہ ہے کہ مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں

۳۔تیسری صورت یہ ہے کہ امام اقامت کے وقت مسجد میں موجود ہو،اس کا حکم یہ ہے کہ امام اور مقتدی **حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح** پر کھڑے ہوں۔

فقہائے احناف کے مذکورہ بالا نظریات کے بشمول،دیگر مذاہب فقہیہ کے معتمد

فقہا کے نظریات بھی تفصیل کے ساتھ دلائل وشواہد کی روشنی میں زیر نظر کتاب کی زینت ہیں۔ان نظریات پر تفصیلی گفتگو سے صرف نظر کرتے ہوئے قارئین کی خدمت میں بس اتنا عرض ہے کہ اس پورے مسئلے کا غائرانہ مطالعہ ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اس مسئلے میں ہمیں آپس میں دست وگریباں ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ کیفیت و معمول کے مطابق تینوں صورتوں میں سے جس صورت پر عمل کیا جائے جائز ودرست ہے، رہا استحباب وعدم استحباب کا معاملہ تو یہ بھی صورت حال پر منحصر ہے۔کسی ایک ہی شکل میں استحباب کو منحصر سمجھنا اصل مسئلہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

زیر نظر کتاب کے مطالعے کے بعد مسئلہ مذکور کی ساری جہتیں آفتاب نیم روز کی طرح آشکارا ہوکر سامنے آجاتی ہیں،ساتھ ہی اسے شعار سنیت بتا کر آپس میں تفریق وانتشار کو ہوا دینے کی سعی نامحمود کی حقیقت بھی واشگاف ہوجاتی ہے۔مسئلہ متذکرہ میں فقہائے احناف کے کسی بھی ایک نظریے پر عامل افراد پر سب وشتم،دشنام طرازی یا کردار کشی نہ صرف افسوس ناک ہے بلکہ شرم ناک بھی۔یہ معاملہ اس وقت اور زیادہ حساس ہوجاتا ہے جب مسئلہ مذکورہ کے جملہ پہلوؤں سے ناواقف حضرات اس مسئلے کو شعار سنیت بنا کر خود اپنی ہی جماعت کے افراد پر طرح طرح سے الزام تراشی بلکہ اتہام وبہتان تراشی کی کوشش کرتے ہیں،اس لیے اس مسئلے کے جملہ پہلوؤں سے واقفیت کس قدر ضروری ہے اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔

خانقاہ عالیہ عارفیہ،سید سراواں،الہ آباد کا معمول بہا مسئلہ اقامت کے حوالے سے فقہائے احناف کے تین واضح نظریات میں سے دوسرا نظریہ ہے اور یہاں جو کیفیت ہے اس کے لحاظ سے شروع اقامت کے وقت ہی امام ومقتدی کا کھڑا ہونا فقہ حنفی کے نقطہ نظر سے مستحب ہے اور اس پر یہاں کے بزرگوں کا توارث بھی ہے اور اس صورت پر عمل صرف اس خانقاہ ہی کا معمول نہیں ہے بلکہ اہل سنت کی بہت سی قدیم خانقاہوں کا بھی عمل وتوارث

ہے جس پر صاحب کتاب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ اس کے برعکس جہاں اقامت کے درمیان کھڑے ہونے کا معمول ہے وہ بھی اپنی جگہ درست ہے، البتہ کسی ایک صورت پر بے جا اصرار ضرور غلط ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ایک ترجیحی مسئلہ ہے، لہٰذا جہاں جو صورت متحقق ہے اس کے لحاظ سے عمل کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس مقام کے لحاظ سے اسی صورت پر عمل مستحب ہے۔

زیر نظر کتاب ''مسئلۂ اذان و اقامت: ایک معتدل نظریہ'' کے مصنف عزیز گرامی مولانا اصغر علی مصباحی ہیں۔ مرشد گرامی حضور داعی اسلام کے دامن کرم سے وابستہ ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم جامعہ عارفیہ میں ہوئی ہے، یہاں کے بعد جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے بھی تحصیل علم اور سند فراغت حاصل کی ہے۔ پھر جامعہ عارفیہ کے شعبۂ دعوہ میں ایک سالہ تخصص کا کورس بھی کیا ہے۔ فی الحال جامعہ کی لائبریری اور تدریس کی خدمت پر مامور ہیں۔ وفا شعار، محنتی، جفاکش اور فرائض منصبی کی ادائیگی کے حوالے سے مخلص ہیں۔ خانقاہ کے تربیتی ماحول میں تعلیم وتربیت نے موصوف کی فکر میں اعتدال و میانہ روی کی جو روح پھونکی ہے، قارئین اس کتاب میں اس کی جھلک بجا طور پر محسوس کریں گے۔

موصوف نے نہایت سنجیدہ اور شائستہ اسلوب میں مسئلہ اذان و اقامت کے جملہ پہلوؤں کی تفہیم کی ہے، جذبات و تعصب سے اپنی تحریر کو یکسر پاک رکھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے مسئلہ متذکرہ کا علمی مطالعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ علمی تحقیق کے منہج کو اپناتے ہوئے موصوف نے اصل ماخذ و مصادر سے براہ راست استفادہ کیا ہے، کتاب کے نام کا حسن انتخاب بھی موصوف کی اعتدال پسندانہ روش کا غماز ہے۔ **اللھم زد فزد**

صاحب کتاب کے تحقیقی و علمی ذوق کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ

انہوں نے اقامت کے وقت حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کے سلسلے میں متاخرین فقہائے احناف کے موقف پر سب سے اہم دلیل صاحب مضمرات کی عبارت سے پیدا شدہ ایک اشتباہ کا بہت عمدہ علمی ازالہ کیا ہے اور مضمرات کے قلمی نسخے کو دریافت کر کے مسئلہ کی اصل حقیقت کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ **کذا فی المضمرات** کے ذریعے بعد کے فقہی کتابوں میں جس طرح سے ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت کی بات کی گئی ہے، موصوف نے اس کی اصل حقیقت پیش کی ہے، دل چسپ بات یہ ہے کہ خود مضمرات میں صاحب مضمرات علامہ یوسف بن عمر صوفی (۸۳۲ھ) نے مسئلہ مذکور اور اس پر مستدل جس اثر کو دلیل کی بنیاد بنایا ہے خود اس اثر میں مسئلہ کی کون سی صورت اور شکل مذکور ہے اسے علمی اسلوب میں موصوف نے ایسا مدلل پیش کیا ہے جس سے اہل علم کے درمیان مذکورہ مسئلہ کی اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے اور پیدا شدہ اشتباہ کا ازالہ ہوجاتا ہے، یہ حصہ خاص طور سے قابل مطالعہ ہے۔

اسی طرح اذان ثانی کے مسئلے میں داخل مسجد یا بیرون مسجد کے سلسلے میں سنت و توارث اور اہل علم کے درمیان علمی اختلاف کے تعلق سے صاحب کتاب نے جو علمی تطبیق اور رفع نزاع کی معتدل فکر پیش کی ہے وہ بھی قارئین کو خصوصی مطالعہ کی دعوت دیتی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس تطبیق کے بعد مسئلے کی بہتر تفہیم سامنے آئے گی اور اہل علم اس مسئلے کو اہل سنت کے درمیان نزاع و تفریق کے بجائے فقط ترجیح کے طور پر لیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کی منفی روش سے باز آئیں گے۔

یہ کتاب اگرچہ ایک فرعی مسئلے میں معتدل راستے کی رہنمائی کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کا علمی منہج اور اسلوب بیان ایسا ہے جو شاہ صفی اکیڈمی کی علمی اشاعتی معیار کے موافق ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس علمی پیش کش کو بنظر تحسین دیکھیں گے۔

اخیر میں بس اتنا عرض کیا جانا ضروری ہے کہ چھوٹے چھوٹے اورفرعی و استحبابی مسائل پر دست وگریباں ہونا،سب وشتم کا بازارگرم کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔اہل سنت کی صفوں کومنتشر کرنے کے بجائے داخلی اتحاد کومزید مضبوط کرنے کی طرف اپنی توجہ کو مرتکز کرنے کی ضرورت ہے۔ہمارے اصل حریف کون ہیں؟اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اہل سنت اور اہل تصوف کے مخالفین کون لوگ ہیں جن کی کوششیں انسانیت کے لئے بھی آزار بنی ہوئی ہیں اور جواسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کا سامان فراہم کررہے ہیں،ان کو پہچاننے کی ضرورت ہےاور ان کے خلاف بہت ہی سنجیدہ علمی اور تنظیمی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ہم اپنی جماعتی قوت کواپنے اصل حریف پر لگانے کے بجائے خوداپنی ہی جماعت میں غیرشعوری طور پرصرف کررہے ہیں۔اس فکرمیں ہمیں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔جماعتی شیرازہ بندی کےخلاف کسی بھی سعی کونامرادکرنے کی ضرورت ہے۔

دعاہے کہ رب کریم ہمیں ہرطرح کی عصبیت اورنفسانیت سے محفوظ رکھےاورہمیں ان کاموں میں اپنی قوت کوصرف کرنے کی توفیق دے جس میں اس کی رضاشامل ہو۔آمین

حسن سعید کان اللہ لہ

خانقاہ عالیہ عارفیہ،سیدسراواں

۱۸رشوال المکرم ۱۴۳۸ھ/ ۱۳رجولائی ۲۰۱۷ء

عرض حال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لولیہ والصلاہ والسلام علی خیر خلقہ ومن سار علی منھجہ

اللہ تعالی کا احسان ہے کہ اس نے خانقاہ عالیہ عارفیہ میں چار سال سے تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ لائبریری کی خدمت کا بھی موقع عنایت فرمایا، جو میرے لیے باعث صد افتخار ہے، میں اللہ کی اس عنایت پر جتنا نازاں رہوں کم ہے، اس نے میرے لیے اس میں جو سکون واطمینان رکھا ہے وہ شاید کسی بادشاہ کو بھی اپنے محل میں میسر نہ ہو۔

لیکن یہ اطمینان وسکون اس وقت بے اطمینانی اور بے سکونی میں بدل جاتا جب بعض طلبہ لائبریری میں آکر مجھ سے اذان ثانی اور اقامت کے تعلق سے کوئی کتاب طلب کرتے۔ میں نے بعض طلبہ سے دریافت کیا کہ اس موضوع پر کیوں مطالعہ کرنا چاہتے ہو؟ تو انہوں نے بتایا کہ اس حوالے سے کچھ لوگ اکثر پریشان کرتے رہتے ہیں اور ہدف طعن بناتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں مجھ سے بیان کی جاتیں، لیکن میں ان کو کوئی تحقیقی اور اعتدال پر مبنی کتاب کی طرف رہنمائی کرنے سے قاصر رہتا۔ میرے دل میں خیال آتا کہ کیوں نہ اس موضوع پر ایک علمی و تحقیقی انداز میں مبنی بر اعتدال کتاب لکھی جائے، جو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو محیط ہو، لیکن جب میں اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کی طرف نظر کرتا تو پسینہ چھوٹ جاتا، اسی سوچ میں چار سال گزر گئے۔ ناچار میں نے مشائخ کی ہمتوں کے سہارے اس کا عزم مصمم کرلیا، اس امید کے ساتھ کہ اس موضوع پر کسی حد تک علمی باتیں جمع کرسکوں۔

مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس تھا اس لیے میں بار بار اپنے مشفق استاذ حضرت مولانا

غلام مصطفی ازہری انعام صفی صاحب کی جانب رجوع کرتا، وہ ہر وقت میری رہنمائی فرماتے تھے، اس لیے میں پورے وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں جو مفید اور کارآمد باتیں درج کر سکا ہوں وہ حضرت ازہری صاحب ہی کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہیں، حضرت کی عنایتیں مجھ پر مسلسل رہتی ہیں، میں ان کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ساتھ ہی بے حد ممنون ہوں استاذ محترم حضرت مولانا ذیشان احمد مصباحی صاحب کا، آپ نے ناچیز پر کرم فرماتے ہوئے اس کتاب کا بغور جائزہ لیا، جگہ جگہ اصلاحات فرمائیں اور اس کی ترتیب وتصحیح میں اپنا قیمتی وقت دیا۔

میں سراپا منت شناس ہوں مخدوم گرامی حضرت مولانا حسن سعید صفوی کا جنھوں نے تمام تر مصروفیات کے باوجود اس کتاب کو پڑھا، مفید مشورے دیے اور پیش لفظ لکھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی، اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان کے فیوض وبرکات سے مالا مال فرماتا رہے۔

اخیر میں اپنے رب کریم سے دعا گو ہوں کہ

خداوندا! میری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما اور اس کے قارئین کے لیے اس کو سامان ہدایت بنا۔ اگر یہ کاوش وجہ فتنہ بنے، اس سے تشدد پروان چڑھے یا تیرے بندے اس کے ذریعہ گمرہی خریدیں تو اس کو ان تک پہنچنے سے پہلے پہلے نسیاً منسیاً بنا کر اپنی کائنات کے کسی گم نام گوشے میں ڈال دے اور اگر میرے قلم کی سیاہی سے گمرہی ٹپکے تو اس کو لکھتے وقت میرے قلم کی سیاہی خشک کر دے۔

اے رب کریم! مجھ سے دین کا وہ کام لے جو تیری رضا کا داعی ہو اور تیرے بندوں کے لیے تیرے قرب کا ذریعہ بنے۔

اصغر علی مصباحی

مکتبۃ الاحسان، خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں

۲۱؍شوال المکرم ۱۴۳۸ھ/ ۱۶؍جولائی ۲۰۱۷ء

فقہی اختلاف؛ رحمت یا زحمت

اسلام کے بنیادی اصول ثابت ومحکم ہیں جن میں محض احوال واشخاص کی بنیاد پر تبدیلی نہیں کی جا سکتی، لیکن یہ بھی غلط ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ زمانے کے تغیرات کو قانون شریعت میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ شریعت محمدیہ انسان کے لیے آخری چراغ ہدایت ہے اس لیے اس نے ہدایت وضلالت کے بنیادی اصول بتا دیے ہیں، عبادت وریاضت کے طریقے اور خطوط کی وضاحت کر دی ہے، انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے حدود متعین کر دیے ہیں جو انسان کو ہمیشہ صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ رہے جزوی یا وقتی مسئلے تو ان کو شریعت کے بتائے ہوئے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اور اس کے مقرر کردہ حدود کے دائرے میں رہ کر ہر زمانے میں طے کرنے کی اجازت ہے، یہ کام اجتہاد کے ذریعے انجام پاتا ہے اور اسی کے ذریعے شریعت اسلامیہ میں استحکام وارتقا کا سلسلہ جاری ہے۔

امت اسلامیہ کے اختلاف کو ہم تین حصوں میں بانٹتے ہیں:

۱۔ اصول دین میں اختلاف جیسے اللہ، ملائکہ، کتب سماوی، رسولان عظام پر ایمان، صوم وصلاۃ کی فرضیت، خمر وربا اور حسد وغیبت کی حرمت وغیرہ۔ ایسا اختلاف کفر ہے۔

۲۔ وہ قواعد عامہ یا فروع محکمہ جن پر عامۃ المسلمین اور جمہور اہل اسلام متفق ہوں جیسے اجماع کی حجیت۔ جمہور اہل اسلام اور سواد اعظم کے متفقات سے عدول گمرہی اور ضلالت ہے۔

۳۔ باقی رہے وہ فروع جن میں ایک سے زیادہ احتمالات پائے جاتے ہیں اور وہ

نو پید مسائل جن پر کوئی نص نہیں وارد ہے، ایسے مسائل میں اختلاف روا ہے بلکہ صحابہ و تابعین کے زمانے میں بلکہ بعد کے زمانہ میں بھی واقع ہے۔

فقہ اسلامی کی ابتدائی چند صدیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فہم نصوص، ثبوت وعدم ثبوت، اختلاف نصوص، تطبیق، جمع اور ترجیح کی بنیاد پر قدیم وجدید مسائل میں مجتہدین صحابہ واجلہ تابعین وتبع تابعین نے اختلاف کیا ہے۔

نصوص شرعیہ کے فہم میں صحابہ کے اختلاف کی ایک مثال لفظ ''قرء'' ہے جس کا معنی حضرت ابن مسعود اور حضرت عمر کے نزدیک حیض، جب کہ حضرت زید بن ثابت کے نزدیک طہر ہے۔

یہ تو نص قرآنی کے فہم کا مسئلہ تھا لیکن حدیث رسول کے فہم میں بھی عہد نبوی سے ہی اختلاف کا دور شروع ہو گیا تھا، غزوۂ بنی قریظہ کا قصہ محدثین وفقہا سب کے نزدیک مشہور ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ جب ہم لوگ غزوۂ خندق سے لوٹے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ۔** ہر شخص عصر کی نماز بنی قریظہ ہی میں ادا کرے گا۔ اتفاق سے عصر کا وقت راستے میں ہی ہو گیا۔ ایک جماعت نے نماز عصر وہیں ادا کر لی جب کہ دوسری جماعت نے بنی قریظہ پہنچ کر ادا کی۔ ہم میں سے کسی نے دوسرے کو غلط نہیں کہا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے بھی کسی کو کچھ نہیں کہا۔(۱)

قرآن کی طرح سنت کا علم یکساں طور پر تمام صحابہ کرام کو بیک وقت حاصل نہیں تھا، کیوں کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی نہ کوئی صحابی ضرور ہوتا تھا لیکن ہر صحابی ہمیشہ آپ کے پاس نہیں ہوتا تھا، البتہ بعض لوگ اکثر اوقات آپ کے پاس رہتے تھے، بعض تبلیغ، غزوات وسرایا کے لیے ادھر ادھر کا سفر بھی کرتے تھے، بعض تجارت، کھیتی باڑی اور

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من الاحزاب، ومخرجہ الی بنی قریظۃ...(۵ / ۱۱۲، ص: ۴۱۱۹)

دوسری ضروریات میں مشغول ہوتے تھے جب کہ بعض معاملات صرف عورتوں کے لیے خاص تھے یا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر پر ہی ہوتے تھے اس لیے ان معاملات کا علم ازواج مطہرات یا صحابیات ہی کو ہوتا تھا۔

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد ابتدائی عہد میں حدیث کا علم یکساں طور پر سب کے پاس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ جب کسی صحابی کے پاس حدیث نہیں ہوتی تو وہ اپنے اجتہاد سے کسی مسئلے میں ایک فتوی دیتے لیکن کسی دوسرے صحابی کے پاس اس مسئلہ سے متعلق حدیث موجود ہوتی تو وہ حدیث کے مطابق جواب دیتے پھر اگر اس جواب اور اس حدیث کا علم پہلے صحابی کو ہو جاتا تو وہ اپنے فتوی سے رجوع کر لیتے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے میت کی بیٹی اور بہن کی موجودگی میں پوتی کے لیے فتوی دیا کہ اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ پورا مال بہن اور بیٹی کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہو جائے گا۔ لیکن آپ نے سائل سے یہ بھی فرمایا کہ تم اس مسئلہ کے لیے عبداللہ ابن مسعود کے پاس جانا وہ بھی یہی بتائیں گے۔ سائل حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آیا اور ان کے پاس اپنا مقدمہ رکھا، ساتھ ہی حضرت ابوموسی اشعری کا فتوی بھی بتایا۔ آپ نے فرمایا: اگر میں ان کی موافقت کروں تو درستگی کو نہ پاسکوں گا کیوں کہ میرے پاس سنت ہے، اس لیے میں اس کے حق میں وہی فیصلہ کروں گا جو فیصلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بیٹی کے لیے نصف ہے، پوتی کے لیے چھٹا حصہ اور اس کے بعد جو بچتا ہے وہ بہن کو ملے گا۔ جب یہ خبر حضرت ابوموسی اشعری کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ سنت رسول کے بعد کسی سوال کی حاجت ہی نہیں۔(۱)

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات ضروریات دین کی حیثیت رکھنے

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابنۃ الابن مع بنت (۸/ ۱۵۱، ح: ۶۷۳۵)

والے یعنی قطعی الدلالۃ وقطعی الثبوت (۱) مسائل کو بھی مقاصد شرع کے پیش نظر ساقط کر دیا گیا جیسے مستحقین زکات میں مؤلفۃ القلوب کا ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے اس کے باوجود علت یا مقصد شرع کے پیش نظر صحابہ کرام نے اس کو مستحقین کی فہرست سے خارج کر دیا۔

اسی طرح سد ذرائع کے نام پر مباح کو حرام کا درجہ دیا گیا ہے جیسے عہد رسالت اور خلیفہ اول کے زمانے میں عورتوں کو مساجد میں آنے اور جماعت میں شریک ہونے کی اجازت تھی لیکن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فساد زمانہ کی بنیاد پر ان کو مسجد میں آنے سے روک دیا اور صحابہ نے ان کے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کیا۔

ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دین کی مضبوطی یا قرب الٰہی کے لیے بدعت کو سنت تسلیم کیا گیا جیسے باضابطہ امام کی اقتدا میں تراویح کی نماز، جمعہ میں ایک اذان کا اضافہ وغیرہ

گویا فروعی اور مجتہد فیہ مسائل میں اختلاف کی بنیاد جب صحابہ کرام کے عہد زریں میں ہی پڑ چکی تھی تو بعد کے ادوار میں اختلاف ناگزیر ہے اور یہ اختلاف احوال واشخاص کو مدنظر رکھتے ہوئے رحمت ہے زحمت نہیں، آسانی اور وسعت کا سبب ہے، سختی اور تنگی کا باعث نہیں۔

بلکہ بقول امام عبد الوہاب شعرانی قدس سرہ شریعت محمدیہ میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ حقیقۃً احوال واشخاص کا اختلاف ہے، رخصت وعزیمت کا اختلاف ہے، صاحب رخصت، رخصت پر اور صاحب عزیمت، عزیمت پر عمل کرے، اس کی تفصیل میزان الشریعۃ الکبریٰ کے مقدمہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

سیدنا عمر بن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ اگر صحابہ اختلاف نہ کرتے تو مجھے خوشی نہ ہوتی کیوں کہ ان کے اختلاف کی وجہ سے ہی رخصت کا دروازہ کھلا۔(۲)

ان اختلافات کو شیخ ابن تیمیہ نے قراءت کے اختلاف سے تعبیر کیا ہے، کیوں کہ ہر

---

(۱) قطعی الثبوت؛ وہ نص جو ہم تک متواتراً پہنچی ہو یعنی اس میں جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔ قطعی الدلالۃ؛ وہ نص جو ایک سے زائد تفسیر کا احتمال نہ رکھتی ہو یعنی اس کا صرف ایک ہی معنی ہو۔

(۲) عبد الرحمن سخاوی/ المقاصد الحسنۃ، باب اول، حرف ہمزہ (ص:۷۰)

قراءت جائز ہے، سود مند ہے، ضرر رساں نہیں، اگر چہ کوئی کسی کو ترجیح دے اور کسی کو چھوڑ دے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرا کو مختلف قراءت پر قرآن پڑھنے کی اجازت دی ہے، لیکن انھیں دین میں افتراق پیدا کرنے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

یہ بات واضح رہے کہ جہاں اسلام کے بنیادی مسائل میں اختلاف تفرقہ اور انتشار کا سبب ہے، وہیں جزوی اور فرعی مسائل میں اختلاف باعث رحمت ہے مگر یہ رحمت اور آسانی بھی اس وقت زحمت کی صورت اختیار کر لیتی ہے جب ہویٰ پرستی اور تعصب مذہبی میں ان فروعی مسائل کو اصول کا درجہ دے دیا جاتا ہے، تفردات کو اجماع اور فتوے کو نص قرآنی اور سنت متواترہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، یعنی اپنے فتوی اور قول کو پوری امت پر نافذ کرنے کی سعی نامشکور کی جاتی ہے، جو سراسر گمرہی ہے۔

اللہ عزوجل امام مالک کے مرقد پہ رحمت و نور کی بارش فرمائے، ان سے عباسی خلیفہ نے کہا کہ آپ موطا کے نسخے تیار کرا دیں تاکہ میں اس کو تمام بلاد اسلامیہ میں بھیج دوں اور وہاں کے گورنروں کو حکم دے دوں کہ وہ اس کے مطابق احکام نافذ کریں تو آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو کیوں کہ ہر شہر میں صحابہ میں سے کوئی نہ کوئی پہنچا اور وہاں تابعین میں سے اہل علم موجود ہیں، لوگ اپنے شہر کے علم پر عمل کر رہے ہیں، اب ان کو اس سے منع کرنا ان کے لیے مشقت کا باعث ہوگا، خلیفہ نے کہا کہ اگر آپ مجھے نہ روکتے تو میں ایسا ضرور کرتا۔(۲)

ایک متفقہ قاعدہ ہے: **لَا يُنْكَرُ الْمُخْتَلَفُ فِيهِ وَإِنَّمَا يُنْكَرُ الْمُجْمَعُ عَلَيْهِ** (۳) مختلف فیہ پر عمل کرنے والے پر کوئی مواخذہ نہیں، مواخذہ صرف اجماعی مسائل کے خلاف عمل کرنے والے پر ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ

---

(۱) احمد بن عبد الحلیم بن تیمیۃ الحرانی/ اقتضاء الصراط المستقیم (۴/ ۵۴)

(۲) ابو نعیم/ حلیۃ الاولیاء (۶/ ۳۳۲)

(۳) سیوطی/ الاشباہ والنظائر (ص:۱۵۸) القواعد الفقہیۃ وتطبیقاتہا فی المذاہب الاربعۃ (۲/ ۷۵۷)

الْمُنْكَرِ (لقمان: ١٧) معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي المَعْرُوفِ (١) اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اتباع جائز نہیں، طاعت تو صرف معروف میں ہے۔

اس حدیث میں دو کنارے متعین کر دیے گئے ہیں۔ ایک طرف یہ متعین ہے کہ طاعت صرف معروف میں واجب ہے تو دوسری طرف یہ ہے کہ منکر میں کسی کی اطاعت نہیں۔ شرع میں معروف و منکر اس کو کہتے ہیں جس کا کرنا اور نہ کرنا نصوص میں بیّن اور واضح ہو، یعنی فرض و واجب اور حرام قطعی میں کسی کی اتباع نہیں، ان دونوں حدود کے درمیان آپ کو اختیار ہے جس مذہب یا جس مسلک کو چاہیں اختیار کریں۔

اب اس کے بعد مرحلہ آتا ہے واجب اجتہادی اور حرام اجتہادی کا۔ آپ پر ضروری ہے کہ جس مذہب فقہی کو آپ نے اختیار کر رکھا ہے، اس کے مطابق واجب اجتہادی کا اتباع کریں اور حرام اجتہادی سے اجتناب کریں، اس کے بعد یہ بھی مناسب ہے کہ اس مذہب کے مستحبات اور اولیٰ امور کا اتباع کریں، لیکن یہ اتباع واجب نہیں اور نہ ہی کسی کو اس کے لیے مجبور کرنا جائز ہے۔ پھر اس کے بعد مرحلہ آتا ہے ان امور کا جن کا استحباب بھی مختلف فیہ ہوتا ہے اور بسا اوقات کوئی مسئلہ صرف کسی ایک مذہب فقہی کے علما کے درمیان مختلف فیہ ہوتا ہے، ایسے امور میں تشدد، سخت گیری، مناظرہ، اصرار اور جنگ انتہائی درجے کی سفاہت جہالت اور دین کی سماحت و رحمت کو زحمت بنانے کے ہم معنی ہے۔

---

(١) صحیح بخاری، کتاب اخبار الآحاد، باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد...ح: ٧٢٥٧)

مسئلہ اذان واقامت؛ عہد بعہد

اذان کی ابتدا:

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ نے مدینہ میں ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم فرمایا۔ جب مسجد تعمیر ہو چکی، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ نماز باجماعت کی دور دور تک اطلاع کے لیے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے اس سلسلے میں مشاورت فرمائی، جس میں یہ چند تجاویز سامنے آئیں:

۱۔ آگ روشن کر دی جائے۔

۲۔ ناقوس بجایا جائے۔

۳۔ بگل بجایا جائے۔

۴۔ ایک جھنڈا بلند کر دیا جائے۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان میں سے کوئی مشورہ پسند نہ آیا۔ یہ سعادت ایک صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن زید کو حاصل ہوئی، آپ فرماتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں کافی متفکر تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں ناقوس ہے، میں نے اس سے کہا: اے اللہ کے بندے! کیا تم اس ناقوس کو فروخت کرو گے؟ اس نے پوچھا: تم اس کا کیا کرو گے؟ میں نے کہا: میں اس سے نماز کے لیے لوگوں کو بلاؤں گا۔ اس نے کہا: کیا میں تم کو اس سے زیادہ بہتر چیز نہ بتاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، اس نے کہا: تم کہو:

اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰہِ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰہِ

حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ

حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ

اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ

لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ

پھر وہ شخص مجھ سے تھوڑی دور چلا گیا، پھر اس نے کہا: جب تم نماز کی اقامت کہو، تو یوں کہنا:

اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰہِ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰہِ

حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ

حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ

قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ

اللّٰہُ أَکْبَرُ، اللّٰہُ أَکْبَرُ

پھر جب صبح ہوئی، تو میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا تھا اس کو بتایا، آپ نے فرمایا: إن شاء الله ! یہ برحق خواب ہے، تم کھڑے ہو کر خواب میں سنے ہوئے اذان کے کلمات بلال کو بتاؤ اور بلال اذان دیں کیوں کہ ان کی آواز تم سے زیادہ بلند ہے۔ میں حضرت بلال کے ساتھ کھڑا ہو گیا، میں ان کو

اذان کے کلمات بتاتا رہااور وہ اذان دیتے رہے۔حضرت عمر بن خطاب اپنے گھر میں تھے،انھوں نے اذان سنی تو وہ اپنا تہبند گھسیٹتے ہوئے نکلے۔اور بارگاہ رسالت میں عرض گذار ہوئے: اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’وللہ الحمد‘‘(۱)

اس واقعہ کے بعد باضابطہ نماز باجماعت کے لیے اذان دی جانے لگی۔اس سے پہلے اگرچہ نماز کی فرضیت کا حکم آچکا تھا،لیکن اذان کا رواج نہ تھا۔

اذان ثانی کا اضافہ:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے عہد مبارک میں دیگر نمازوں کی طرح جمعہ کے لیے بھی صرف ایک اذان ہی ہوتی تھی، بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کی ابتدا میں بھی ایک ہی اذان ہوتی تھی لیکن جب آپ نے دیکھا کہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو چکی ہے اور لوگ صحیح وقت پر جمعہ کی نماز میں نہیں پہنچ پا رہے ہیں ،تو آپ نے لوگوں کی آسانی اور پیشگی اطلاع کے لیے مزید ایک اذان کا اضافہ فرمایا، تاکہ لوگ وقت پر جمعہ کی جماعت میں بہ آسانی شریک ہو جائیں۔ یہ وجہ معقول بھی ہے اس لیے کہ اس سے پہلے اذان جمعہ کے معاً بعد خطبہ شروع ہوتا تھا اور خطبہ کے اختتام کے ساتھ ہی جمعہ کی نماز شروع ہو جاتی تھی، ظاہر ہے کہ خطبہ کا دورانیہ اتنا طویل نہیں ہوتا کہ اس بیچ سارے لوگ آجائیں۔حضرت عثمان سے پہلے جب جذبۂ دین نسبتاً زیادہ تھا،لوگ اسی مختصر وقت میں مسجد میں آجاتے رہیں ہوں گے لیکن جب حضرت عثمان نے دیکھا کہ لوگوں کو مسجد پہنچنے کے لیے وقت کم ہے،اس لیے اس سے پہلے اعلان عام کے لیے مقام زورا پر ایک اذان کا اضافہ کیا۔

بخاری کی روایت ہے،حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں:

---

(۱) سنن ابی داود، کتاب الاذان، باب کیف الاذان، ح:۴۹۹)

كَانَ النِّدَاءُ يَوْمَ الجُمُعَةِ أَوَّلُهُ إِذَا جَلَسَ الإِمَامُ عَلَى المِنْبَرِ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَ النِّدَاءَ الثَّالِثَ عَلَى الزَّوْرَاءِ قَالَ أَبُو عَبْدِاللهِ: "الزَّوْرَاءُ" مَوْضِعٌ بِالسُّوقِ بِالْمَدِينَةِ(۱)

جمعہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عہد میں اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا تھا۔ جب حضرت عثمان غنی کا عہد خلافت آیا اور لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگئ تو حضرت عثمان غنی نے مقام ''زوراء'' پر تیسری اذان کا اضافہ کر دیا، امام بخاری نے کہا: ''الزوراء'' مدینہ کے بازار میں ایک جگہ ہے۔

اس حدیث میں تیسری اذان سے مراد وہ اذان ہے جو جمعہ کے دن سب سے پہلے مسجد سے باہر دی جاتی ہے، چوں کہ اقامت کو بھی اذان کہہ دیا جاتا ہے، اس لیے کل تین اذان ہوگئیں، ایک اقامت اور دو اذان۔

تثویب کا اضافہ:

اذان کے ذریعہ نماز کی اطلاع دینے کے بعد دوبارہ کسی کلمے کے ذریعہ نماز کی اطلاع دینے کو تثویب کہتے ہیں، مثلاً ''الصلاۃ، الصلاۃ'' کہنا، یا ''اذان ہوگئ'' یا اس کے مثل دوسرے الفاظ جن سے نماز کی اطلاع مل جاتی ہو۔ یہ تمام متاخرین فقہا کے نزدیک جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

(وَيُثَوِّبُ) بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ فِي الْكُلِّ لِلْكُلِّ بِمَا تَعَارَفُوهُ... إِلَّا فِي الْمَغْرِبِ(۲)

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب الاذان یوم الجمعۃ، ح: ۹۱۲)

(۲) ردالمحتار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/ ۳۸۹)

مغرب کے علاوہ ہر نماز کے لیے اذان واقامت کے درمیان تثویب
کہنی چاہیے، ان کلمات کے ذریعہ جن سے لوگ واقف ہوں۔

عنایہ میں ہے:

وَأَحْدَثَ الْمُتَأَخِّرُونَ التَّثْوِيبَ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ عَلَى حَسَبِ مَاتَعَارَفُوهُ فِي جَمِيعِ الصَّلَوَاتِ سِوَى الْمَغْرِبِ (۱)

متاخرین فقہا نے مغرب کے علاوہ ہر نماز کے لیے اذان واقامت کے درمیان لوگوں کے عرف کے مطابق تثویب کو ایجاد کیا ہے۔

عنایہ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تثویب کا رواج پہلے نہ تھا، فقہائے متاخرین نے مصلحت کی بنا پر اس کو رائج کیا۔

اذان کی ابتدا کا واقعہ، جمعہ کے دن مزید ایک اذان کا اضافہ اور پھر تثویب کا اضافہ ،ان سب پر غور کرنے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اذان واقامت کا مقصود لوگوں کو نماز کی اطلاع دینا ہے اور اذان کو بھی اذان اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہی ''خبر دینا، آگاہ کرنا'' ہوتے ہیں۔ اس لیے صحابہ کرام اور فقہائے عظام اپنے اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق اس میں اس کے مقاصد کے پیش نظر ترمیم کرتے رہے ہیں اور اس طرح ہر زمانے میں بھی اس کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے حذف واضافہ کیا جا سکتا ہے۔

الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ

یہ بات تو طے ہے کہ جس اذان کی تعلیم صحابی رسول کو خواب میں دی گئی تھی اس میں ''الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کے الفاظ نہیں تھے، اس کا اضافہ بعد میں ہوا۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ اس کا اضافہ کس نے کیا؟ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اضافہ

(۱) عنایہ شرح ہدایہ، باب الاذان (۱/۲۴٦)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور حضور نے اس کو برقرار رکھا اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اضافہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک مؤذن نے کیا جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ثابت رکھا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اضافہ کرنے پر دلیل وہ روایت ہے جو سنن ابن ماجہ میں آئی ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أَنَّهُ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤْذِنُهُ بِصَلَاةِ الْفَجْرِ، فَقِيلَ: هُوَ نَائِمٌ، فَقَالَ: الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ، الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ، فَأُقِرَّتْ فِي تَأْذِينِ الْفَجْرِ، فَثَبَتَ الْأَمْرُ عَلَى ذَلِكَ۔ (۱)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز کی اطلاع دینے کے لیے آئے، تو آپ سے بتایا گیا کہ حضور آرام فرما ہیں، تو آپ نے دومرتبہ کہا: ''الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' آپ کے اس اضافے کو اذان میں شامل کرلیا گیا اور اس طرح یہ سلسلہ جاری ہوگیا۔

امام طبرانی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَا أَحْسَنَ هَذَا يَا بِلَالُ اجْعَلْهُ فِي أَذَانِكَ (۲)

اے بلال! یہ کتنی اچھی چیز ہے، اس کو اذان میں شامل کردو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اضافہ کرنے پر دلیل وہ روایت ہے جس کو امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

إِنَّ الْمُؤَذِّنَ جَاءَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يُؤْذِنُهُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ، فَوَجَدَهُ نَائِمًا، فَقَالَ: الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ، فَأَمَرَهُ عُمَرُ أَنْ يَجْعَلَهَا فِي نِدَاءِ الصُّبْحِ (۳)

---

(۱) سنن ابن ماجہ، باب السنۃ فی الاذان (۱/ ۲۳۷، ح:۷۱۶)
(۲) طبرانی/المعجم الکبیر (۱/ ۳۶۶، ح:۱۰۷۲)
(۳) مؤطا امام مالک۔ کتاب وقوت الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء، ح: ۱۹۳)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس موذن نماز فجر کی اطلاع دینے کے لیے آیا تو آپ کو سوتا ہوا دیکھ کر کہا: ''الصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے موذن کو حکم دیا کہ اس کو فجر کی اذان میں شامل کر دیں۔

ان دونوں روایتوں میں محدثین نے تطبیق دی ہے، لیکن یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ الصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ پہلے اذان میں نہیں تھا، اس کا اضافہ بعد میں بر بنائے مصلحت ہوا ہے اور وہ مصلحت یہ تھی کہ فجر کا وقت سونے کا وقت ہوتا ہے۔ اس لیے سونے والے کو متنبہ کرنے کے لیے اس کے اضافے کو روا رکھا گیا۔

صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ کا اضافہ:

اسی طرح اذان کے اندر صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ کا بھی اضافہ ہوا؛ یہ خواب میں اللہ کی طرف سے سکھائی گئی اذان میں نہیں تھا، اس کا بھی اضافہ ایک ضرورت کے تحت ہوا۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

أَذَّنَ ابْنُ عُمَرَ فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ بِضَجْنَانَ، ثُمَّ قَالَ: صَلُّوا فِي رِحَالِكُمْ، فَأَخْبَرَنَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُ مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ، ثُمَّ يَقُولُ عَلَى إِثْرِهِ: أَلاَ صَلُّوا فِي الرِّحَالِ، فِي اللَّيْلَةِ البَارِدَةِ، أَوِ المَطِيرَةِ فِي السَّفَرِ (۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مقام ''ضجنان'' میں سردی کی رات میں اذان دی اور پھر کہا: صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ، (اپنی قیام گاہ میں نماز ادا کرلو۔) اور فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے موذن کو اس کا حکم دیتے تھے اور موذن اذان مکمل کرنے کے بعد سردی کی رات میں یا سفر میں بارش کی حالت میں صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ کہتے تھے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر...، ح: ۶۳۲)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت نعیم بن نحام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ مُؤَذِّنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ وَأَنَا فِي لِحَافِي، فَتَمَنَّيْتُ أَنْ يَقُولَ: صَلُّوا فِي رِحَالِكُمْ، فَلَمَّا بَلَغَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، قَالَ: "صَلُّوا فِي رِحَالِكُمْ" ثُمَّ سَأَلْتُ عَنْهَا، فَإِذَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَمَرَهُ بِذَلِكَ۔ (۱)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنا، اس وقت میں لحاف میں تھا، میں نے سوچا کہ کاش وہ یہ کہتے کہ ''اپنی اپنی قیام گاہ میں نماز ادا کرلو، تو جب وہ ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' پر پہنچے تو کہا ''اپنی قیام گاہ میں نماز ادا کرلو'' پھر میں نے بعد میں ان سے پوچھا کہ کیا حضور نے ایسا کہنے کا حکم دیا تھا؟ تو انھوں نے کہا: ہاں! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا حکم فرمایا تھا۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے:

إِنَّهُ قَالَ لِمُؤَذِّنِهِ فِي يَوْمٍ مَطِيرٍ: إِذَا قُلْتَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، فَلَا تَقُلْ: حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، قُلْ: صَلُّوا فِي بُيُوتِكُمْ. قَالَ: فَكَأَنَّ النَّاسَ اسْتَنْكَرُوا ذَاكَ، فَقَالَ: أَتَعْجَبُونَ مِنْ ذَا، قَدْ فَعَلَ ذَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّي، إِنَّ الْجُمُعَةَ عَزْمَةٌ، وَإِنِّي كَرِهْتُ أَنْ أُحْرِجَكُمْ فَتَمْشُوا فِي الطِّينِ وَالدَّحْضِ (۲)

حضرت عبداللہ بن عباس نے بارش کے دن اپنے مؤذن سے کہا: کہ جب تم أَشْهَدُ أَن لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ کہنا تو اس کے بعد حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ مت کہنا، بلکہ اس کی جگہ صَلُّوْا فِي بُيُوتِكُمْ کہنا۔ لوگوں کو یہ بات عجیب لگی، تو آپ نے فرمایا: تم

---

(۱) مسند احمد (۲۹ / ۴۵۳، ح: ۱۷۹۳۳) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب الرخصۃ لمن سمع النداء، (۱ / ۵۰۱، ح: ۱۹۲۶)

(۲) صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب الصلاۃ فی الرحال فی المطر (ح: ۱۶۳۷)

لوگ تعجب کررہے ہو؟ ایسا انھوں نے کیا ہے جو مجھ سے بہتر تھے۔ ہر چند کہ جماعت سے نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے،لیکن میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تم لوگ مٹی اور کیچڑ میں چل کر آؤ۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ **صلو فی رحالکم** کا اضافہ **حی علی الصلاۃ** کی جگہ پر ہونا چاہیے اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اضافہ اذان ختم ہونے کے بعد ہونا چاہیے۔

علامہ عینی نے فرمایا ہے کہ دونوں جائز ہے لیکن دوسری صورت افضل ہے۔(۱) لیکن میرے خیال میں اسے **حی علی الصلاۃ** کی جگہ پر ہی ہونا زیادہ بہتر ہے۔ اور اس طرح پہلی صورت ہی اولیٰ ہے۔ دوسری صورت پر غور کریں۔ اس کے مطابق مؤذن **حی علی الصلاۃ** کے ذریعے نماز کی دعوت دے اور پھر اذان کے بعد **صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ** کہہ کر منع کرے، ظاہر ہے پہلی صورت کے بالمقابل یہ غیر مناسب ہے۔ بہرحال ان روایتوں کی روشنی میں یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ یہ اذان میں اضافہ کیا گیا تھا، جو بہرکیف ایک مناسب امر تھا۔

اس قدر اذان میں تبدیلی ہونے سے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ اذان کا مقصود صرف نماز کی اطلاع ہے، اس لیے اس میں حسب ضرورت ردوبدل کیا جاسکتا ہے جس سے اس کا مقصد حاصل ہو اور خواہ مخواہ لوگ بددل نہ ہوں۔

قبل اذان واقامت درودشریف کا اضافہ:

اس آخری دور میں بھی اذان سے پہلے ایک اضافہ رونما ہوا کہ بعض مسجدوں میں اذان واقامت سے پہلے درودشریف کا اضافہ کیا جانے لگا ہے۔ علما نے اس کو جائز کہا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اس کو اذان واقامت سے بالکل متصل یا جہر کے ساتھ نہ پڑھا

---

(۱) الأمران جائزان وبعد الفراغ أحسن (عمدۃ القاری، کتاب الاذان، باب الکلام فی الاذان (۵/ ۱۲۸)

جائے تا کہ سننے والے اس کو اذان واقامت کا جز نہ سمجھ لیں، جیسا کہ اعلی حضرت فاضل بریلوی اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں:

درود شریف قبل اقامت پڑھنے میں حرج نہیں مگر اقامت سے قبل چاہیے یا درود شریف کی آواز، آواز اقامت سے ایسی جدا ہو کہ امتیاز رہے اور عوام کو درود شریف جزوِ اقامت (اقامت کا حصہ) نہ معلوم ہو۔(۱)

لیکن آج اذان واقامت سے بالکل متصل جہر کے ساتھ درود شریف پڑھا جاتا ہے، جو سراسر اذان مسنون کے خلاف ہے۔فاضل بریلوی کی اس تنبیہ کے باوجود افسوس کہ بہت سارے لوگوں نے اس تنبیہ کو مکمل طور سے نظر انداز کر دیا ہے بلکہ بعض علاقوں میں اذان و اقامت سے متصل بلند آواز سے درود پڑھنے کا ایسا رواج چل پڑا ہے کہ اس کے خلاف ورزی موذنین کے لیے مہنگی پڑ جاتی ہے۔بعض علاقوں میں اسے نہ صرف اقامت کا حصہ بلکہ سنیت کا شعار بھی بنانے کی ہوڑ چل پڑی ہے۔اذان واقامت کا یہ طریقہ نہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھا، نہ بعد کے ادوار میں اس کا کوئی رواج ہوا۔،اسی لیے معاصر محقق علامہ غلام رسول سعیدی اس حوالے سے اپنا دوٹوک موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اگر اذان واقامت سے قبل فصل کر کے درود شریف جہر کے ساتھ دائما پڑھا جائے تو درود شریف پڑھنے کے استحباب کے عمومی دلائل کی بنا پر اس کو ناجائز یا بدعت سیئہ کہنا تو باطل ہے اور اس کے جواز اور استحباب میں بھی کوئی شک نہیں ہے،لیکن اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مدینہ منورہ میں دس سال اذان دی جاتی رہی،خلفاے راشدین کے دور میں تیس سال اذان دی جاتی رہی اور سو سال تک عہد صحابہ اور تابعین میں اذان دی جاتی رہی اور کسی دور میں بھی اذان سے پہلے یا بعد فصل کر کے جہراً

(۱) فتاوی رضویہ(۵/ ۳۸۶)

درود شریف نہیں پڑھا گیا اور آٹھ صدیوں تک مسلمان اسی طریقہ سے اذان دیتے رہے تو آیا اذان دینے کا افضل طریقہ وہ ہے جس طریقہ سے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں اذان دی جاتی تھی یا وہ افضل طریقہ ہے جو آٹھویں صدی میں ایجاد ہوا؟

اگر چہ اذان کا مروجہ طریقہ بھی ناجائز یا بدعت سیئہ نہیں ہے لیکن ہم پوری امانت اور دیانت اور شرح صدر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اذان دینے کا افضل طریقہ وہی ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ہے جس طریقہ سے آپ کے سامنے اذان دی جاتی رہی۔'' (۱)

علامہ سعیدی صاحب کے اس موقف سے یہ بات تو سمجھ میں آ گئی کہ اس کی ایجاد بعد میں ہوئی، جو اپنے دلائل کی بنا پر جائز تو ہے لیکن ساتھ ہی یہ سنت نبوی، سنت صحابہ وتابعین اور طریقہ مسلمین کے خلاف ہے، لیکن آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اس کو نہ صرف جواز کے دائرہ میں رکھتے ہیں بلکہ اب ہم اس کو ''شعار اہل سنت'' میں داخل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں اور جمعہ کے دن خطبہ کی اذان جس کو دوسری صدی کی ابتدا سے لے کر اب تک کے علما، فقہا اور مشائخ بشمول غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی کے، مسجد کے اندر دیتے ہوئے آ رہے ہیں، اس کو ہم خلاف سنت کہہ کر مسجد کے باہر دلوانے پر پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ اسے کوئی سنت سمجھے، مسئلہ یہ ہے کہ کوئی جوش عناد میں امت کے اس عظیم توارث کو بدعت، ضلالت، خلاف سنت، موضوعِ اصلاح و دعوت اور عنوانِ جبر و وحشت سمجھے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں امت وسط کی خوبیوں سے آراستہ فرمائے۔

---

(۱) شرح صحیح مسلم (۳/ ۱۰۹۴)

اذان کہاں دی جائے؟

اذان کہاں دی جائے؟ اس کا محل کیا ہو؟ اس حوالے سے احادیث میں چند الفاظ ملتے ہیں، جن سے محل اذان کی تعیین ہوتی ہے، لیکن اس میں جو چیز قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ اذان ایسی جگہ ہونی چاہئے جہاں سے آواز دور دور تک پہنچے۔

سنن ابوداؤد کی حدیث ہے:

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ امْرَأَةٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ، قَالَتْ: كَانَ بَيْتِي مِنْ أَطْوَلِ بَيْتٍ حَوْلَ الْمَسْجِدِ وَكَانَ بِلَالٌ يُؤَذِّنُ عَلَيْهِ الْفَجْرَ (۱)

حضرت عروہ بن زبیر، بنی نجار کی ایک عورت سے روایت کرتے ہیں۔ وہ بیان کرتی ہیں: مسجد نبوی کے قریب میرا گھر سب گھروں میں اونچا تھا، اس لیے حضرت بلال اسی پر فجر کی اذان دیتے تھے۔

دوسری حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

إِنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ زَيْدٍ الْأَنْصَارِيَّ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ رَجُلًا قَامَ وَعَلَيْهِ بُرْدَانِ أَخْضَرَانِ عَلَى جِذْمَةِ حَائِطٍ فَأَذَّنَ (۲)

---

(۱) سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاذان فوق المنارۃ (ح:۵۱۹) سنن کبری، کتاب الصلاۃ، باب الاذان فی المنارۃ (۱/ ۴۲۵، ح:۱۸۴۶)

(۲) مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الاذان والاقامۃ، ما جاء فی الاذان والاقامۃ کیف ھو (ح:۲۱۱۸) مسند احمد (۳۶/ ۳۵۵، ح:۲۲۰۲۷) مصنف عبد الرزاق، کتاب الصلاۃ، باب بدء الاذان (۱/ ۴۶۱، ح:۱۷۸۸) سنن دارقطنی، باب الصلاۃ، باب ذکر الاقامۃ واختلاف الروایات فیھا (ح:۹۳۷)

حضرت عبد اللہ بن زید انصاری حضور ﷺ کی بارگاہ میں آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جس پر دو سبز چادریں ہیں، وہ دیوار پر چڑھا اور اذان دی۔

بعض روایتوں میں **سقف المسجد یاسطح المسجد** کا لفظ آیا ہے۔(۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کے اوپر اذان کہی۔

ابو برزہ اسلمی فرماتے ہیں:

مِنَ السُّنَّةِ الْأَذَانُ فِي الْمَنَارَةِ وَالْإِقَامَةُ فِي الْمَسْجِدِ (۲)

منارہ پر اذان دینا اور مسجد میں اقامت کہنا سنت ہے۔

ان تمام روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ اذان اونچے گھر، دیوار، مسجد کی چھت اور منارہ پر دی جانی چاہیے اور ان جگہوں پر اذان دینے کا مقصد یہ ہے کہ اذان کی آواز دور تک جائے، کیوں کہ اس سے مقصود لوگوں کو نماز کے وقت ہونے کی اطلاع دینا ہے اور یہ اطلاع بدرجہ اتم اسی وقت ہوگی جب اذان کی آواز دور تک جائے، لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اذان مسجد کی چھت پر یا مسجد سے باہر ہی کسی بلند جگہ پر ہونی چاہیے۔اس حکمت بالغہ کا اعلان سراج امت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے سنیے:

امام محمد نے امام ابوحنیفہ سے عرض کیا: **فَأَيُّهُمَا أَحبُّ إِلَيكَ أَن يُؤَذنَ الْمُؤَذِّن علي المنارة أَو فِي صحن الْمَسْجِد؟** آپ کے نزدیک اذان دینا کہاں مستحب ہے منارہ پر یا صحن مسجد میں؟

آپ نے فرمایا: **أَحبُّ ذَلِک إِلَيَّ أَن يكونَ أَسْمَعَهُ لِلْقَوْمِ وَ الْجِيرَان و كُلّ**

---

(۱) ابن سعد/ الطبقات الکبری (۱/ ۲۴۷) سیوطی/ جمع الجوامع؛ مسند عبد اللہ بن زید (۲۰/ ۵۷۶) بحوالہ ابوالشیخ

(۲) سنن کبری، کتاب الصلاۃ، باب الاذان فی المنارۃ (۱/ ۴۲۵، ح: ۱۸۴۶)

ذَلِک حَسَن۔ اذان ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں سے لوگوں اور پڑوسیوں کو زیادہ سنائی دے اور یہ دونوں جگہیں مناسب ہیں۔(۱)

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھراذان خطبہ دنیا کی تمام مساجد میں منبر کے قریب مسجد کے اندر کیوں ہوتی ہے؟ تو اس حوالے سے عرض کر دیں کہ یہ اذان بھی عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مسجد کے باہر ہی ہوتی تھی، جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے:

حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ يُؤَذَّنُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ (۲)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن منبر پر جلوہ افروز ہوتے اس وقت آپ کے سامنے مسجد کے دروازہ پر اذان دی جاتی تھی، اسی طرح حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں بھی تھا۔

لیکن جب ہشام بن عبدالملک (عہد حکومت: ۱۰۵-۱۲۵ھ) والی مقرر ہوا تو اس نے وہ اذان جس کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مقام ''زورا'' پر دلوائی تھی، منارہ پر کر دیا اور ایک ہی مؤذن تھا جو وقتِ زوال کے بعد اذان دیتا تھا اور اس اذان کو جو عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکر، وعمر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے دور خلافت کے ابتدائی زمانے میں منارہ پر ہوتی تھی، خطیب کے سامنے کر دیا۔(۳)

چونکہ وہ ایک حکمران تھا، اس لیے اس نے اس کو ہر جگہ نافذ کر دیا اور اس کے بعد

---

(۱) المبسوط کتاب الصلاۃ، باب من نسی صلاۃ وذکرھا من الغد (۱/۱۳۷)

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب النداء یوم الجمعۃ (ح:۱۰۸۸) طبرانی/المعجم کبیر (۷/۱۴۵، ح:۶۶۴۲)

(۳) ابن الحاج/المدخل، الکرسی الکبیر الذی یعملونہ فی الجامع (۲/۲۹۶، ۲۹۷)

پھر یہی طریقہ رائج ہو گیا، جیسا کہ ''عنایہ شرح ہدایہ'' میں ہے:

(وَإِذَا صَعِدَ الْإِمَامُ الْمِنْبَرَ جَلَسَ وَأَذَّنَ الْمُؤَذِّنُونَ بَيْنَ يَدِي الْمِنْبَرِ) بِذَلِكَ جَرَى التَّوَارُثُ وَلَمْ يَكُنْ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم - إِلَّا هَذَا الْأَذَانُ (۱)

جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو مؤذن منبر کے سامنے اذان دے، یہی امت کا توارث ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں صرف یہی اذان تھی۔

فقہائے کرام نے منبر کے سامنے اذان ہونے پر کوئی تعرض نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اذان سے جو مقصد لوگوں کو نماز کی اطلاع دینا ہے وہ منارہ پر دی جانے والی اذان سے حاصل ہو جاتا ہے اور اذان ثانی سے صرف خطبہ کا اعلان ہے، لہٰذا مقصود حاصل ہو گیا، اس لیے پوری امت نے اسی کو اختیار کر لیا۔ پھر یہ کہ اذان مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ نماز کی اطلاع کے لیے مشروع ہوئی ہے، اسی لیے مختلف اوقات میں اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، اسی لیے اس تبدیلی سے بھی شریعت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لیے بعد کے فقہا نے بھی اس کو جاری رکھا اور اپنی اپنی کتابوں میں اسی صورت کو لکھا ہے۔ البحر الرائق میں ہے:

(فَإِذَا جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ أُذِّنَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَأُقِيمَ بَعْدَ تَمَامِ الْخُطْبَةِ) بِذَلِكَ جَرَى التَّوَارُثُ (۲)

جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو اس کے سامنے اذان دی جائے اور بعد خطبہ اقامت کہی جائے، اسی پر توارث ہے۔

---

(۱) العنایۃ شرح الہدایۃ (۲/۱۱۷ ۴)

(۲) البحر الرائق، باب صلاۃ الجمعۃ (۲/۱٦۹)

اذان عندالمنبر پر امت کا توارث

اور بین یدی الخطیب کا مفہوم

سنت اور تواتر و توارث میں فرق:

سنت کے لغوی معانی طریقہ، دستور، طبیعت، عادت اور شریعت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں اس کی تعریف کئی طرح سے کی جاتی ہے:

علامہ ابن عابدین شامی سنت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

مَا ثَبَتَ بِقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ أَوْ بِفِعْلِهِ وَ لَيْسَ بِوَاجِبٍ وَ لَا مُسْتَحَب

(۱) جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول یا فعل سے ثابت ہو اور واجب و مستحب بھی نہ ہو۔

علامہ علاؤ الدین بخاری حنفی (۷۳۰ھ) نے سنت کی تعریف میں مزید وسعت پیدا کی ہے، آپ فرماتے ہیں:

هُوَ الطَّرِيقَةُ الْمَسْلُوكَةُ فِي الدِّينِ مِنْ غَيْرِ افْتِرَاضٍ، وَ لَا وُجُوبٍ (۲)

سنت دین میں اس رائج طریقے کو کہتے ہیں جو فرض و واجب نہ ہو۔

توارث؛ قرنا بعد قرن امت کے تعامل کا نام ہے۔ (۳)

تعامل: یہ باب تفاعل کا مصدر ہے اور ''عمل'' سے بنا ہے، اس کا لغوی معنی دو یا دو

---

(۱) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الطھارۃ، سنن الوضوء (۱/ ۱۰۴)

(۲) کشف الاسرار شرح اصول البزدوی (۲/ ۳۰۲)

(۳) فتاوی رضویہ (۲۸/ ۲۳۸)

سے زائد لوگوں کا شریک ہونا اور اصطلاح شرع میں تعامل اسے کہتے ہیں جس پر کثرت سے لوگ عمل پیرا ہوں۔

البحر الرائق میں ہے: **التَّعَامُلُ هو الْأَكْثَرُ اسْتِعْمَالًا** (۱)

تعامل وہ ہے جس پر کثرت سے عمل ہو رہا ہو۔

''تعامل وتوارث'' اور اسی طرح ''عرف'' فقہی اعتبار سے سب ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ اگر یہ تعامل وتوارث اور عرف عہد رسالت سے ہو تو یہ سنت تقریری بھی ہے اور تعامل وتوارث بھی۔ اسی لیے اس کو سنت متواترہ یا سنت متوارثہ کہتے ہیں یہ سنت قطعیت کی حیثیت رکھتی ہے اس کے لیے کسی خاص سند کی حاجت نہیں۔

اسی طرح سے صحابہ کرام یا بعد کے کسی دور میں کسی امر کا تعامل وتوارث ہو گیا ہو وہ بھی حجت شرعیہ کی ایک قسم ہے، اس سے بھی احکام ثابت ہوتے ہیں، کیوں کہ ہر زمانے میں پوری امت کا کسی غیر شرعی حکم پر متفق ہونا محال ہے، ارشاد نبوی ہے:

لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ هَذِهِ الْأُمَّةَ عَلَى الضَّلَالَةِ أَبَدًا (۲)

اللہ تعالی اس امت کو کبھی بھی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔

لیکن اگر یہ تعامل کسی نص صریح کے حکم کو ختم کر رہا ہو تو اسے بلا کسی علت وسبب کے دلیل شرعی نہیں بنائیں گے۔ علامہ ابن عابدین شامی اس کی حجیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

إِنَّ الْعُرْفَ الْعَامَ لَا يُعْتَبَرُ إِذَا لَزِمَ مِنْهُ تَرْكُ الْمَنْصُوْصِ وَ إِنَّمَا يُعْتَبَرُ إِذَا لَزِمَ مِنْهُ تَخْصِيْصُ النَّصِّ (۳)

---

(۱) البحر الرائق (۵/ ۲۱۹)

(۲) حاکم/ المستدرک، کتاب العلم (۱/ ۲۰۰، ح: ۳۹۲)

(۳) رسائل ابن عابدین شامی، الرسالۃ الاولی (ص: ۴۸)

عرف عام اس وقت حجت ہوتا ہے جب اس سے نص کا ترک لازم نہ آئے، ہاں! اگر اس سے صرف نص کی تخصیص لازم آتی ہو تو اس سے اس کی حجیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کی ایک مثال البحر الرائق میں ہے کہ خلفائے راشدین اور عمین کریمین رضی اللہ عنہم کا ذکر جمعہ کے خطبہ میں نہ تھا لیکن یہ مسلمانوں کے تعامل وتوارث کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے، چنانچہ صاحب بحر رقم طراز ہیں: وَ ذِكْرُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ مُسْتَحْسَنٌ بِذَلِكَ جَرَى التَّوَارُثُ وَيَذْكُرُ الْعَمَّيْنِ اه (۱)

یعنی خلفائے راشدین اور عمین کریمین حضرت امیر حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کا ذکر جمعہ کے خطبہ میں مستحسن ہے، کیوں کہ اس پر مسلمانوں کا توارث ہے۔

اسی طرح اعلی حضرت فاضل بریلوی ذکر ولادت کے موقع پر کھڑے ہو کر صلاۃ و سلام پڑھنے کو تعامل سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولا عزوجل توفیق دے تو منصف غیر متعصب کے لیے اسی قدر کافی کہ یہ فعل اعنی قیام وقت ذکر ولادت حضور خیر الانام علیہ وعلی آلہ افضل الصلاۃ والسلام صدہا سال سے بلاد دار الاسلام میں رائج ومعمول اور اکابر علما میں مقرر ومقبول (۲)

اذان ثانی داخل مسجد ہونے کا تعامل وتوارث:

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوسری صدی کے اوائل تک اذانِ خطبہ یعنی اذان ثانی مسجد کے باہر ہی ہوتی تھی لیکن منبر کے سامنے مسجد کے اندر اذان دینے کا عمل ہشام بن عبد الملک کے زمانے سے شروع ہوا، یہ ۱۰۵ھ میں خلیفہ ہوا پھر اس کے بعد سے آج تک پوری امت کا عمل اسی پر ہوتا رہا ہے۔

---

(۱) البحر الرائق (۲/ ۱۶۰)

(۲) فتاوی رضویہ (۲۶/ ۵۰۴)

علامہ ابن عبد البر (۳۶۸-۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

والأذان الواجب لها إذا جلس الإمام على المنبر فإن أذن مؤذن في صومعة وأذن غيره بين يدي الإمام فلا بأس لأنه قد عمل به قديما في المدينة... وقال مالک: الأذان بين يدي الإمام ليس من الأمر القديم (۱)

جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو جمعہ کے لیے اذان دینا واجب ہے، اگر ایک مؤذن منارہ سے اذان دے اور دوسرا امام کے سامنے سے اذان دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ مدینہ منورہ کا قدیم معمول یہی ہے۔

کچھ سطور کے بعد لکھتے ہیں: لیکن امام مالک فرماتے ہیں: امام کے سامنے اذان دینا قدیم معاملہ نہیں ہے۔

امام دار الہجرۃ حضرت مالک رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ واضح ہوا کہ امام کے سامنے مسجد کے اندر اذان دینا اگرچہ عہد رسالت میں نہیں تھا لیکن ان کے زمانے میں یہی مدینہ کا معمول بن گیا تھا۔ کیوں کہ امام مالک کے اس قول: **بين يدي الإمام** میں مواجہت کا معنی لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اس کا مطلب امام کے سامنے خارج مسجد یا باب مسجد پر اذان ہے تو پھر ان کے دوسرے جملے: **ليس من الأمر القديم** کا کوئی مطلب نہیں رہ جائے گا۔ کیوں کہ یہ مسلم ہے کہ پہلے ایک اذان ہوتی تھی جس سے مقصود مصلیوں کو نماز کے لیے پکارنا تھا اور وہ مسجد سے باہر ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ امام کی پیدائش ۹۳ھ میں اور وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی تھی۔

یہ بیان ہو چکا کہ اموی دور میں اذان خطبہ مسجد کے اندر دینے کی شروعات ہوئی لیکن اس کے ساتھ ایک دوسری بدعت بھی شروع ہوئی کہ ایک ساتھ مسجد کے مختلف زاویے سے کئی اذانیں ہوتیں ائمہ نے اس کو ناپسند کیا اس لیے وہ بدعت رک گئی، پہلی بدعت یعنی

---

(۱) الکافی فی فقہ اہل المدینۃ: باب صلاۃ الجمعۃ (۱/۲۵۰)

اذان عندالمنبر پر کسی نے کچھ نہیں کہا، وہ متوارث ہوگئی، امام محی الدین نووی (۶۷۶ھ) نے ان دونوں مسئلوں کے بارے میں امام شافعی (۱۵۰۔۲۰۴ھ) کا قول نقل کیا ہے امام شافعی ائمہ مجتہدین میں سے ہیں اور علما نے انھیں دوسری صدی کا مجدد بھی تسلیم کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

أُحِبُّ أَنْ يَكُونَ لِلْجُمُعَةِ أَذَانٌ وَاحِدٌ عِنْدَ الْمِنْبَرِ وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يَكُونَ الْمُؤَذِّنُ وَاحِدًا(۱)

امام شافعی نے فرمایا کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جمعہ کے لیے منبر کے پاس [کئی اذانوں کی جگہ] ایک ہی اذان ہو اور [اذان واقامت کے لیے] مستحب ہے کہ ایک ہی موذن بھی ہو۔

سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ (۴۷۰۔۵۶۱ھ) اپنی کتاب الغنیہ (۲) میں فرماتے ہیں:

یجتنب البیع والشراء بعد الأذان عند المنبر لقوله تعالی وهذا هو الأذان

---

(۱) المجموع شرح المہذب، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۳/ ۱۲۴)

(۲) یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ کچھ لوگ کا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب غوث الثقلین شیخ عالم پیر دستگیر شہنشاہ بغداد قدس اللہ سرہ کی نہیں ہے لیکن ان لوگوں کے اس نظریہ پر بعض علما نے کلام کیا ہے جیسے: علامہ عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی اپنی کتاب ''الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل'' میں اس کتاب کی نسبت حضور غوث پاک کی طرف ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: علامہ ابن حجر اور اکابر علما کی کتابوں میں اس کی نسبت ان ہی کی طرف مذکور ہے ۔لہٰذا ان کی تصنیفات کی فہرست سے سرے سے خارج ہی کر دینا قابل قبول نہیں ہے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ جو بھی اس کتاب کا اول تا آخر گہرائی سے مطالعہ کرے گا اس پر قطعی طور پر منکشف ہوجائے گا کہ یہ کتاب ان ہی کی تصنیف کردہ ہے۔(الرفع والتکمیل، ص: ۳۸۰) اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی بھی اسی طرف مائل ہیں کہ یہ کتاب حضور غوث پاک کی ہے۔ملاحظہ کریں: فتاوی رضویہ (۲۹/ ۲۲۲)

الذي كان على عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وهو واجب عندنا ولغير هذه الصلاة فرض على الكفاية وروي عنه أنه سنة. وأما أذان المنارة أمر به عثمان بن عفان رضي الله عنه في زمانه لمصلحة عامة، وهي إعلام الغائبين عن الأمصار و القرى فلا يبطل البيع و الشراء(١)

خرید وفروخت منبر کے پاس دی جانے والی اذان سے حرام ہو جاتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ** (الجمعۃ:۹) (اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن اذان ہو جائے تو ذکر الٰہی کی طرف چل پڑو اور خرید وفروخت یک لخت بند کردو۔) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں صرف یہی ایک اذان تھی، یہ ہمارے نزدیک واجب ہے اور اس نماز کے علاوہ اذان فرض کفایہ ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ اذان سنت ہے۔ اور رہ گئی [جمعہ کے دن] منارہ پر دی جانے والی اذان تو یہ وہ اذان ہے جس کا حکم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں ایک مصلحت عامہ کی وجہ سے دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ اس اذان کے ذریعہ شہر اور قصبہ سے دور لوگوں کو بھی جمعہ کی خبر ہو جائے، لہٰذا اس اذان سے خرید وفروخت حرام نہیں ہوگی۔

حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ نے منبر کے پاس اذان خطبہ ہونے کی صراحت کی ہے۔ آپ کے اس ارشاد سے پتا چلتا ہے کہ آپ کے زمانے میں بھی خطبہ کی اذان مسجد کے اندر منبر کے پاس ہی ہوتی تھی۔

اسی طرح امام سرخسی (۴۹۰ھ) کی مبسوط میں ہے

فَكَانَ الطَّحَاوِيُّ يَقُولُ هُوَ الْأَذَانُ عِنْدَ الْمِنْبَرِ بَعْدَ خُرُوجِ الْإِمَامِ... فَكَانَ الْحَسَنُ بْنُ زِيَادٍ يَقُولُ الْمُعْتَبَرُ هُوَ الْأَذَانُ عَلَى الْمَنَارَةِ لِأَنَّهُ لَوْ انْتَظَرَ الْأَذَانَ عِنْدَ

---

(١) الغنیۃ لطالبی الحق عز وجل، القسم الرابع فی فضائل الاعمال، (فصل) اما صلاۃ الجمعۃ (۲ / ۲۱۳)

الْمِنْبَرِ يَفُوتُهُ أَدَاءُ السُّنَّةِ وَسَمَاعُ الْخُطْبَةِ الخ (۱)

امام طحاوی (۴۹۰ھ) فرماتے ہیں کہ [خرید وفروخت کی ممانعت اور ذکر کی طرف سبقت کے سلسلے میں] اس اذان کا اعتبار ہوگا جو امام کے خطبہ کے لیے نکلتے وقت منبر کے پاس دی جاتی ہے...اور حسن بن زیاد (۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ اس اذان کا اعتبار ہوگا جو منارہ پر ہوتی ہے، کیوں کہ اگر اس اذان کا انتظار کیا جائے جو منبر کے پاس ہوتی ہے تو ہو سکتا ہے کہ سنت کی ادائیگی اور خطبہ سننا بھی فوت ہو جائے۔

یہاں یہ قول حسن بن زیاد کی طرف منسوب ہو کر بیان کیا گیا ہے جب کہ یہی قول ''البنایہ فی شرح الہدایہ'' میں حضرت حسن بن زیاد کی روایت سے امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے۔(۲)

بہر حال اس مذکورہ بالا عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ سعی کا وجوب اور خرید وفروخت کی حرمت کس اذان پر ثابت ہوگی۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ منبر کے پاس دی جانے والی اذان سے سعی کا وجوب اور خرید وفروخت کی حرمت ثابت ہوگی اور امام حسن بن زیاد امام ابوحنیفہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس اذان سے سعی کا وجوب اور خرید وفروخت کی حرمت ثابت ہوگی جو منارہ پر دی جاتی ہے؛ کیوں کہ منبر کے پاس اذان سے اگر سعی کو واجب کریں گے تو سنت وغیرہ کی ادائیگی فوت ہو جائے گی۔

امام طحاوی، امام حسن بن زیاد بلکہ امام ابوحنیفہ کے واضح ارشاد سے بھی یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہوگئی کہ ان نفوس قدسیہ کے عہد میں خطبہ کی اذان منبر کے پاس ہی دی جاتی تھی۔

---

(۱) المبسوط، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/ ۱۳۴)

(۲) البنایۃ شرح الہدایۃ، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ (۳/ ۹۰)

یہ واضح رہے کہ **الأذان عندالمنبر** کا لفظ منبر سے قریب اذان دیے جانے کے مفہوم کے لیے صریح ہے۔ اس روایت پر مزید قیل وقال کی گنجائش ہی ختم ہوجاتی ہے کیوں کہ یہاں واضح طور پر **عند** کا لفظ موجود ہے۔

مذکورہ بالا تشریحات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ دوسری صدی کے اوائل ہی سے خطبہ کی اذان مسجد کے اندر ہونے لگی، جو آج تک جاری وساری ہے۔

اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کی تحقیق کے بعد جہاں ان کے متبعین ہوئے اور ان کا فتوی نافذ کیا گیا آج بھی صرف وہیں اذان خطبہ مسجد کے باہر ہوتی ہے اور جن علمی وروحانی مراکز نے اپنے اسلاف کے توارث کی حفاظت کی، وہاں آج بھی اذان ثانی داخل مسجد عندالمنبر ہی ہوتی ہے۔ یہ تو برصغیر کی بات ہوئی، عالم عرب میں آج بھی مساجد اہل سنت میں مسجد کے اندر ہی اذان ہوتی ہے۔

ہندوستان کے اندر ماضی میں اس سلسلے میں اہل اسلام کا توارث کیا تھا؟ اس سلسلے میں اعلی حضرت فاضل بریلوی کے دو اقتباسات پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ اپنے مکتوب بنام شاہ محمد حمداللہ کمال (۱) میں لکھتے ہیں:

''اذان ثانی کا مسئلہ نیازمند کے یہاں ۳۵/ برس سے جاری ہے۔ اکابر علما آئے اور دیکھا اور انکار نہ کیا۔ بارہ برس ہوئے کہ 'تحفہ حنفیہ' [عظیم آباد] میں اس بارے میں فقیر کا فتوی چھپا۔ بعض بلاد میں جب ہی سے اس پر عمل شروع ہوا اور جہاں نہ ہوا، فقیر نے کوئی تعرض نہ کیا کہ زمانہ کثرت جہل، شیوع فتن کا ہے۔ مگر بحمداللہ کسی طرف سے کوئی صدائے مخالفت ہے نہ آئی۔''

آپ اپنے ایک اور مکتوب بنام حضرت مولانا انواراللہ فاروقی (۲) میں لکھتے ہیں:

---

(۱) یہ مکتوب ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۳۲ھ میں لکھا گیا، یہ قلمی مکتوب غیر مطبوع ہے اور ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی ملکیت میں ہے۔ (ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی اگست ۲۰۱۶ء)

(۲) مکتوبات امام احمد رضا بریلوی، ص: ۷۹، از مولانا محمود احمد قادری

''حضرت کو معلوم ہو کہ فقیر کا یہ فتوی ۲۲[۱۳] ھ میں 'تحفہ حنفیہ' میں چھپ کر ملک میں شائع ہو چکا۔ نہ علما نے انکار فرمایا، نہ جہال نے شور مچایا''

فاضل بریلوی کے ان دونوں مکتوبات سے صاف واضح ہے کہ آپ کے فتوی سے پہلے ہندوستان کے تمام شہروں میں اذان ثانی مسجد کے اندر ہی ہوتی تھی، ورنہ ان کے اپنے خیال کے مطابق علما کے انکار اور جہال کے شور مچانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فاضل بریلوی کی اس تحریر کے بین السطور سے یہ بالکل واضح ہے کہ ان کا مذکورہ فتوی ہندوستان میں رائج تعامل وتوارث کے خلاف تھا۔

اذان ثانی کے داخل مسجد ہونے کی حکمت:

اس پوری مدت میں امت کے جلیل القدر فقہا وعلما اور مشائخ گزرے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اِس اذان کو مسجد سے باہر دلوانے پر اصرار نہیں کیا، بلکہ ہر صدی میں مصلحین زماں اور احیاے سنت کے علم بردار آتے رہے، سب نے اپنے زمانے میں دین میں در آنے والی بے شمار بدعات وخرافات کو دور کیا اور اپنی نادر ونایاب تحقیق سے سنت کو زندہ کیا، لیکن اس مسئلے میں کسی نے بھی کوئی قدم نہیں اُٹھایا بلکہ مسجد کے اندر ہی اذان ثانی کو جاری رکھا، اس کی وجہ یہی تھی کہ اس اذان سے مقصود اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو لوگ مسجد میں آچکے ہیں اور وہ نماز یا دیگر اوراد ووظائف میں مشغول ہیں، انھیں یہ اطلاع دے دی جائے کہ اب وہ لوگ خطبہ سننے کی طرف متوجہ ہوں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

قَالَ الْمُهَلَّبُ: الْحِكْمَةُ فِي جَعْلِ الْأَذَانِ فِي هَذَا الْمَحَلِّ لِيَعْرِفَ النَّاسُ بِجُلُوسِ الْإِمَامِ عَلَى الْمِنْبَرِ فَيُنْصِتُونَ لَهُ إِذَا خَطَبَ كَذَا قَالَ، وَفِيهِ نظر، فَإِن فِي سِيَاق بن إِسْحَاقَ عِنْدَ الطَّبَرَانِيِّ وَغَيْرِهِ عَنْ الزُّهْرِيِّ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ بِلَالًا كَانَ

يُؤَذِّنُ عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ فَالظَّاهِرُ أَنَّهُ كَانَ لِمُطْلَقِ الْإِعْلَامِ لَا لِخُصُوصِ الْإِنْصَاتِ
نَعَمْ لَمَّا زِيدَ الْأَذَانُ الْأَوَّلُ كَانَ لِلْإِعْلَامِ وَكَانَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيِ الْخَطِيبِ لِلْإِنْصَاتِ

مہلب نے کہا: داخل مسجد اذان دینے کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو امام کے منبر پر جلوہ افروز ہونے کا علم ہو جائے تا کہ وہ خطبہ کی سماعت کے لیے خاموش ہو جائیں۔ ایسا ہی کہا ہے، لیکن اس حکمت پر اعتراض ہے، کیوں کہ امام طبرانی وغیرہ نے جو ابن اسحاق سے روایت کیا ہے اور انھوں نے زہری سے روایت کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مسجد کے دروازے پر اذان دیتے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہے کہ وہ مطلق اعلام کے لیے تھا نہ کہ صرف خاموش کرانے کے لیے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اذان اول کا اضافہ ہوا تو وہ اعلام کے لیے ہو گیا اور جو اذان خطیب کے سامنے دی جاتی تھی اب وہ لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے ہو گئی۔(۱)

خارج مسجد اذان کے قائلین علما اور ان کے دلائل:

اذان خطبہ کے مسجد سے باہر ہونے کے قائلین کچھ علما رہے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا ذکر ان کے دلائل کے ساتھ کیا جاتا ہے اور پھر ان دلائل کا تجزیہ کیا جائے گا۔

ان میں پہلا نام ابن رشد قرطبی مالکی (۵۲۰ھ)(۲) کا ہے، آپ لکھتے ہیں:

والأذان بين يدي الإمام في الجمعة مكروه، لأنه محدث (۳)

---

(۱) فتح الباری، باب الاذان یوم الجمعۃ (۳/ ۳۱۸)

(۲) ابن رشد نام کے دو عالم گزرے ہیں: (۱) جن کا پورا نام ابو الولید محمد بن احمد بن رشد قرطبی (۵۲۰ھ) یہ ابن رشد جد (دادا) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی تصانیف میں البیان والتحصیل، المقدمات الممہدات مشہور ہیں۔ (۲) ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن رشد قرطبی (۵۹۵ھ) یہ ابن رشد حفید (پوتا) کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی معروف کتابیں؛ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، کتاب النفس، حرکۃ الفلک وغیرہ ہیں۔

(۳) البیان والتحصیل، کتاب الصلاۃ (۱/ ۲۴۳)

جمعہ کے دن خطیب کے سامنے اذان دینا مکروہ ہے کیوں کہ یہ بدعت ہے۔

دوسرا نام علامہ ابوعبداللہ محمد بن محمد عبدری فاسی معروف بہ ابن الحاج مالکی (۷۳۷ھ) کا ہے، جنھوں نے مسجد کے اندر اذان خطبہ کو بدعت قرار دیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

أَنَّ فِعْلَ ذَلِکَ فِي الْمَسْجِدِ بَيْنَ يَدَيِ الْخَطِيبِ بِدْعَةٌ... مِمَّا أَحْدَثَهُ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِکِ... ثُمَّ تَطَاوَلَ الْأَمْرُ عَلَى ذَلِکَ حَتَّى صَارَ بَيْنَ النَّاسِ كَأَنَّهُ سُنَّةٌ مَعْمُولٌ بِهَا (۱)

اذان کا مسجد کے اندر ہونا بدعت ہے... اس کے موجد ہشام بن عبدالملک ہیں... پھر اس بدعت کا رواج اس قدر ہو گیا گویا کہ یہی سنت متوارثہ ہو۔

واضح رہے کہ علامہ ابن الحاج مالکی کی وفات ۷۳۷ھ میں ہوئی ہے اور ہشام کی وفات ۱۲۵ھ میں ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بقول علامہ ابن الحاج دوسری صدی سے آٹھویں صدی تک لوگ اذان خطبہ کو مسجد کے اندر اس طرح دیتے تھے جیسے وہی سنت متوارثہ ہو۔

تیسرا نام علامہ ابراہیم بن موسی بن محمد معروف بہ شاطبی (۷۹۰ھ) کا ہے، یہ بھی مالکی عالم دین ہیں۔ اصولی اور حافظ حدیث ہیں، آپ کا تعلق غرناطہ سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

وَنَقْلُ الْأَذَانِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ مِنَ الْمَنَارِ وَجَعْلُهُ قُدَّامَ الْإِمَامِ. (۲)

اذان خطبہ کو منارے سے منتقل کر کے امام کے سامنے کر دینا بدعت ہے۔

چوتھا نام علامہ ابوالحسنات عبدالحی انصاری فرنگی محلی (۱۳۰۴ھ) کا ہے، آپ لکھتے ہیں:

[وإذا جلس على المنبر أذن ثانيا بين يديه] أى مستقبل الإمام فى المسجد كان أو خارجه و المسنون هو الثانى۔ (۳)

---

(۱) المدخل لابن الحاج، فصل الكرسى الكبير الذى يعملونه فى الجامع (۲/ ۲۰۸)

(۲) الاعتصام للشاطبی، الباب الخامس فی احکام البدع الحقیقیۃ والاضافیۃ والفرق بینھما (۱/ ۴۹۱)

(۳) عمدۃ الرعایہ علی شرح الوقایۃ، کتاب الجمعہ (۲/ ۳۳۳)

[جب امام منبر پر بیٹھ جائے اس وقت اس کے سامنے اذان دی جائے] یعنی امام کے سامنے اذان دی جائے مسجد کے باہر یا اندر۔ اور باہر دینا مسنون ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ فرنگی محلی، اذان ثانی کے صرف باہر مسنون ہونے کے قائل ہیں لیکن مسجد کے اندر ہونے کو بلا کراہت جائز سمجھتے ہیں۔

پانچواں نام اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی (۱۳۴۰ھ) کا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق آپ پہلے حنفی عالم ہیں جو مسجد کے اندر اذان ثانی کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں: ''مسجد میں اذان [ثانی] مکروہ ہے''(۱)

اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس اذان کو باہر کروانے والا میں ہی ہوں۔ ان کی عبارت یہ ہے:

الحمدللہ! یہاں اس سنتِ کریمہ کا احیاء رب عزوجل نے اس فقیر کے ہاتھ پر کیا، میرے یہاں مؤذنوں کو مسجد میں اذان دینے سے ممانعت ہے، جمعہ کی اذانِ ثانی بحمداللہ تعالی منبر کے سامنے دروازہ مسجد پر ہوتی ہے جس طرح زمانہ اقدس حضور پرنور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وخلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں ہوا کرتی تھی۔(۲)

فاضل بریلوی کی اس عبارت سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے اس سنت کریمہ کا احیا فرما کر سب سے پہلے اپنی مسجد سے اس امر کی شروعات کی جس پر آپ سے پہلے نہ آپ کے آباواجداد کا عمل تھا اور نہ آپ کے مشائخ کا۔

آپ سے پہلے مالکی علما میں علامہ ابن رشد، علامہ ابن الحاج اور علامہ شاطبی اگرچہ اس بات کے قائل تھے کہ یہ بدعت ہے لیکن ان میں سے کسی کے حوالے سے ہمیں یہ نہیں

---

(۱) فتاوی رضویہ (۸/ ۵۰۲)

(۲) فتاوی رضویہ (۸/ ۵۰۱)

ملتا کہ انھوں نے اذان ثانی کے خارج مسجد کرانے کی تحریک چلائی ہو اور خارج مسجد رائج کرنے کی کوشش کی ہو۔

اس سیاق میں چھٹا نام معاصر سلفی محقق ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ) کا ہے۔ اہل ظواہر، سلفی جماعت کے سرخیل و ناشر شمار کیے جاتے ہیں، سلف صالحین، مشائخ صوفیہ اور ائمۂ احناف کے مسائل و رسومات کو بدعات قرار دینا اس جماعت کا وتیرہ ہے، ان ہی مسائل میں سے اذان ثانی بھی ہے، جس کو دوسری صدی ہجری کے اوائل سے اہل ایمان ''حسن'' سمجھ کر مسجد کے اندر دے رہے تھے اس کو انھوں نے بدعت میں شامل کیا اور پھر اس کی تردید کی، شیخ البانی لکھتے ہیں:

ولا في المسجد عند المنبر فإنه بدعة أموية(۱)

منبر کے پاس مسجد کے اندر اذان دینا امویوں کی ایجاد کی ہوئی بدعت ہے۔

دلائل کا تجزیہ:

اب ہم ان لوگوں کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔

توارث وعرف بہ مقابلہ احیاے سنت:

اذان ثانی کو داخل مسجد مکروہ قرار دینے والوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عہد رسالت وصحابہ میں کبھی بھی کوئی اذان اندر نہیں دی گئی۔ اس لیے اندر اذان دینا مکروہ ہے۔

اس پر عرض یہ ہے کہ اگر درایت، مقصد شرع اور توارث وعرف کو بالاے طاق رکھ دیا جائے اور اہل ظواہر کی عینک سے دیکھا جائے تو یہ کہنا ہی صحیح ہوگا کہ داخل مسجد اذان دینا بدعت ہے اور خارج مسجد سنت ہے۔

لیکن اگر اذان کی مقصدیت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اذان میں

---

(۱) الاجوبۃ النافعۃ عن اسئلۃ لجنۃ مسجد الجامعۃ (ص:۲۸)

سنت یہ ہے کہ اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وقت کے داخل ہونے اور جماعت قائم کرنے کی خبر دی جائے، اس لیے حدیث میں اذان دینے کے لیے کوئی جگہ خاص نہیں کی گئی ہے بلکہ حدیث سے صرف اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ اذان ایسی جگہ دی جائے جہاں سے دور دور تک آواز پہنچ سکے، اسی حکمت کے پیش نظر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک اذان بازار میں دلوائی تھی تا کہ دور دراز سے لوگ جمعہ میں حاضر ہو سکیں۔

اوائل قرن اول میں یہ محسوس کر لیا گیا کہ اب جمعہ کے دن پہلی اذان سے دور دور آواز پہنچ جاتی ہے، اسی لیے دوسری اذان کو مسجد کے اندر کر دی گئی تا کہ حاضرین سنن ونوافل ترک کر کے خطبہ سننے کے لیے تیار ہو جائیں، یہی وجہ ہے کہ آج لاؤڈ اسپیکر کے زمانے میں بھی خطبہ کی اذان لاؤڈ اسپیکر سے نہیں دی جاتی ہے، جس سے فریقین پر واضح ہے کہ اس اذان کا مقصود دور تک آواز پہنچانا کبھی نہیں رہا۔ اور جب یہ اذان صرف مسجد کے اندر موجود لوگوں ہی کے لیے رہ گئی تو اب اندر اذان دینا مکروہ نہیں ہوگا، جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی ''امداد'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

إِذَا كَانَ التَّفْوِيتُ لِأَمْرٍ عَامٍّ فَالْأَذَانُ فِي الْمَسْجِدِ لَا يُكْرَهُ لِانْتِفَاءِ الْعِلَّةِ

جب کسی امر عام کی وجہ سے لوگوں کی نماز فوت ہو جائے تو مسجد میں اذان دینا مکروہ نہیں ہوگا کیوں یہاں مکروہ ہونے کی علت مفقود ہے۔(۱)

علامہ شامی کا مقصود یہ ہے کہ داخل مسجد اذان ہونے کی جو علت تھی وہ صورت مذکورہ میں مفقود ہے۔ داخل مسجد اذان کی کراہیت کی علت یہ تھی کہ اگر اذان داخل مسجد ہوگی تو اس کی آواز دور دور تک نہیں پہنچے گی اور اس طرح جو اس کا مقصود ہے۔ لوگوں کو جماعت کی اطلاع دینا۔ وہ مقصود فوت ہو جائے گا لیکن مذکورہ بالا صورت میں جب کہ کسی امر عام کے

---

(۱) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/۳۹۱)

سبب سب کی نماز قضا ہوگئی ہے اور جن کی نماز قضا ہوئی ہے وہ سب مسجد میں ہی موجود ہیں، یہاں کسی کو بلانا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اذان کی سنت کو ادا کرنا مقصود ہے تو اگر یہ اذان خارج مسجد دی جائے تو دوسرے لوگ اس سے خلجان اور شک وشبہ میں پڑ جائیں گے اس لیے اس اذان کو داخل مسجد دینا ہی بہتر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی امر پر علما و مشائخ عمل کرنے لگیں تو اگر چہ بعض لوگ اسے مکروہ کہیں پھر بھی صوفیہ علما و مشائخ کے توارث ہی پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی قدس سرہ (۹۲۲ھ) دعائے استفتاح کے بارے میں فتاوی صوفیہ کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:

بعض نے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے انبیا پر اس دعا کے بعض الفاظ کے اطلاق کو مکروہ سمجھتے ہوئے اس سے ان الفاظ کو حذف کر دیا لیکن اہل تصوف۔اللہ ان کی جماعت میں اضافہ فرمائے۔اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اہل بیت نبی سے مروی ہے اور جس طرح سے یہ امام ابو عبداللہ جعفر صادق سے منقول ہے کیوں کہ اس پر توارث ہے اور توارث، تواتر کی طرح ہے۔(۱)

اسی طرح سے مولانا نعیم الدین مرادآبادی [صراط مستقیم] کی تفسیر میں تعامل اور تراث مشائخ صوفیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

صراط مستقیم سے طریق مسلمین مراد ہے اس سے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں کہ جن امور پر بزرگان دین کا عمل رہا ہو وہ صراط مستقیم میں داخل ہے۔(۲)

خاص اذان ثانی کے باب میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِأَنَّ الْمُتَوَارَثَ لَا يَكُونُ مَكْرُوهًا وَ كَذَلِکَ نَقُولُ فِي الْأَذَان بَيْنَ يَدَيْ

---

(۱) مجمع السلوک (۲/۲۱۱)

(۲) خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، سورۃ الفاتحۃ: ۵ (ص: ۳)

الْخَطِیبِ فَیَکُونُ بِدْعَةً حَسَنَةً إِذْمَارَآهُ الْمُؤْمِنُونَ حَسَنًا فَهُوَ حَسَنٌ (۱)

توارث مکروہ نہیں ہوتا جیسے اذان خطبہ مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینا بدعت حسنہ ہے کیوں کہ جسے مومنین اچھا جانیں وہ اچھا ہے۔

علامہ ابن عابدین کا خطیب کے سامنے خطبہ کی اذان کو بدعت حسنہ کہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ **بین یدی الخطیب** سے ان کی مراد مسجد کے اندر اذان کا ہونا ہے ورنہ بدعت کہنا لغو ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اذان مسجد کے اندر دینا مومنین و صالحین کی سنت ہے، امت کا متوارث عمل ہے، اگر بدعت ہے بھی تو بدعت حسنہ ہے، اسے وہی لوگ مکروہ یا بدعت سیئہ سمجھیں گے جو اہل سنت و مشائخ وصوفیہ کے بے شمار معمولات ورسومات سے ہاتھ اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یہ عہد رسالت و زمانہ صحابہ کی سنت نہیں ہے۔

امت کے توارث اور اہل حق کے تعامل کی کیا حیثیت ہے، اس کا ادراک اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کی اس تحریر سے ہوتا ہے آپ ذکر ولادت کے موقع پر کھڑے ہو کر صلاۃ وسلام پڑھنے کو تعامل سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولا عزوجل توفیق دے تو منصف غیر متعصب کے لیے اسی قدر کافی کہ یہ فعل اعنی قیام وقت ذکر ولادت حضور خیر الانام علیہ وعلی آلہ افضل الصلاۃ والسلام صدہا سال سے بلاد دار الاسلام میں رائج و معمول اور اکابر علما میں مقرر و مقبول (۲)

بلکہ عہد رسالت اور عہد شیخین کی بات کریں تو جمعہ کے لیے دو اذان ہی سرے سے بدعت ہے جنھیں احیائے سنت کا شوق ہے وہ جمعہ کی دو اذانوں میں سے ایک اذان کو ہی

---

(۱) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/ ۳۹۰)

(۲) فتاوی رضویہ (۲۶/ ۵۰۴)

سرے سے حذف کرنے کا بیڑا اٹھائیں، اہل ظاہر اور بالخصوص سلفیہ کا استدلال یہی ہے کہ ہر وہ عمل جو عہد رسالت میں نہیں تھا وہ بدعت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

بعض لوگوں کو اس طرح دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ تعامل وتوارث نص کے خلاف ہے کیوں کہ حدیث میں **علی باب المسجد** آیا ہے جو اس بات پر دلیل ہے کہ اذان ثانی مسجد کے باہر ہونی چاہیے۔اس حوالے سے عرض ہے کہ مسلمانوں کا یہ تعامل وتوارث نص کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ حدیث میں مسجد کے اندر اذان دینے کی ممانعت پر کوئی نص نہیں ہے۔لہٰذا یہ کیوں کر کہنا درست ہوگا کہ یہ نص کے خلاف ہے!

اگر ہم اس کو بالفرض مان بھی لیں کہ یہ زمانہ نبوی کے خلاف ہے،تب بھی یہ تعامل وتوارث نص کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ جب حکم زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے بدل جائے اور اس پر مسلمان عمل کرنے لگیں تو وہ سنت کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ سنت کے موافق ہی ہوتا ہے اور اسی پر عمل بھی کیا جائے گا، چنانچہ اس حوالے سے فاضل بریلوی لکھتے ہیں:

ایک استثنائی صورت البتہ ہے کہ وہ بات ہے تو عہد رسالت کے بعد کی اور بظاہر مخالف سنت بھی ہے لیکن زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے اس کا حکم شرعی بدل گیا اور اس تبدیلی پر تمام مسلمانوں کا عمل درآمد جاری وساری ہوگیا۔جیسے حضور ﷺ کے عہد پرنور میں عورتیں مسجد میں جاتی تھیں لیکن بعد میں ان کو عام طور سے مسجد میں حاضر ہونے سے روک دیا گیا۔ یہ حقیقت میں سنت ثابتہ کے مخالف نہیں، بلکہ موافق ہے۔(۱)

بین یدی الخطیب /المنبر کا مفہوم:

بعض لوگ **بین یدی الخطیب /المنبر** کے الفاظ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں یا

---

(۱) فتاوی رضویہ(۲۸ / ۲۴۲)

دھوکہ دیتے ہیں کہ اس سے مراد ''مواجہت'' ہے،اس کے معنی یہ ہیں کہ اذانِ خطبہ بالکل خطیب اور منبر کے سامنے دروازہ پر ہونی چاہیے کیوں کہ ''بین یدیہ'' کا معنی صرف ''قرب'' ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا معنی ''مواجہت'' کے بھی ہوتا ہے،لہٰذا فقہا کی عبارات میں جہاں جہاں ''بین یدیہ'' کا لفظ آیا ہے وہاں ''مواجہت'' مراد ہے۔

میں یہاں یہ عرض کردوں کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے،کیوں کہ فقہا کی عبارات میں لفظ **بین یدیه** سے صرف مواجہت کا معنی مراد لینا اس لیے درست نہیں ہے کہ بعض کتابوں میں لفظ **عند المنبر** اور بعض میں لفظ **في المسجد** کی صراحت ہے جیسا کہ ماقبل میں گزرا۔ یہ عبارتیں قطعی طور پر **بین یدیه** سے قرب کے معنی متعین کرتی ہیں۔ **بین یدیه** سے مواجہت کے ساتھ قرب کے معنی مراد لینے پر دوسری سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ پوری امت خواہ حنفیہ ہوں یا مالکیہ،شافعیہ یا حنبلیہ سب کا عمل قرب ہی کے معنی پر رہا ہے،یعنی سب لوگ خطبہ کی اذان منبر کے سامنے مسجد کے اندر ہی دیتے رہے ہیں جس کی تفصیل ابھی گزری۔ اگر بین یدیہ سے مواجہت کے معنی مراد ہوتے تو اس پر عمل بھی ہوتا، جب کہ ایسا نہیں ہے۔

میں اپنی گفتگو کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ آج کے دور میں اذان کہاں ہو؟ یہ سوال ہی ختم ہو گیا ہے کیوں کہ اذان کا مقصد اعلان ہے اور مائیک سے دی جانے والی اذان خواہ وہ کہیں سے ہو وہ اپنے ہدف کو بدرجہ اتم حاصل کر لیتی ہے۔ دوسری طرف یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اذان خطبہ کا مقصد مسجد سے باہر والوں کو مطلع کرنا نہیں ہے،اس لیے اس کو مسجد سے باہر کرانے کی ضد بھی فضول ہے اور اگر بالفرض کوئی یہ کہتا ہے کہ اذانِ خطبہ کا مقصود بھی قریب و بعید سب لوگوں کو مطلع کرنا ہے تو اسے چاہیے کہ اس زمانے میں اذان خطبہ مسجد سے باہر کرانے کی تحریک کے بجائے اسے مائک پر دیے جانے کی تحریک

چلائے، کیوں کہ اعلان عام کا کامل مقصد اذان کو مسجد سے باہر کرانے میں کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ مائک سے کرانے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اذانِ خطبہ کو مسجد کے باہر ہی دینے پر اگر کوئی مصر ہے اور اس کے خلاف کرنے والے پر بدعت وضلالت کا حکم لگاتا ہے اور عالم گیریت کے اس دور میں اپنی چند مسجدوں کے جدید تعامل کو بنیاد بنا کر اسے سنیت کا شعار قرار دیتا ہے، تو یقیناً ایسے شخص کا قبلہ تفقہ گم ہو گیا ہے۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ پہلے وہ مقاصد شریعت کو سمجھے اور پھر اس کی مشروعیت کا جائزہ لے اور عہد رسالت سے لیکر اب تک اس میں کس طرح کی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان پر ایک نظر ڈالے تا کہ اسے مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھ میں آجائے ورنہ امت کی اجتماعیت کو تار تار کرنے کے علاوہ اسے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔

لا یؤذن فی المسجد سے استدلال کا علمی جائزہ:

بعض حضرات فقہا کی ان عبارتوں سے استدلال کرتے ہیں جو عام اذان کے داخل مسجد دیے جانے سے ممانعت کے سلسلے میں ہے، فقہا کا مقصود یہ ہے کہ عام اذانیں اگر مسجد میں دی جائیں گی تو ان کی آواز دور تک نہیں پہنچے گی، اس طرح اذان کا جو مقصود ہے باہر والوں کو اطلاع دینا وہ فوت ہو جائے گا۔ ان عبارتوں سے استدلال کرتے ہوئے بعض حضرات ان کا انطباق اذان خطبہ پر بھی کرتے ہیں، جو درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اذان خطبہ سے مقصود باہر والوں کو اطلاع دینا نہیں ہے، کیوں کہ اگر باہر والوں کو اطلاع دینا مقصود ہوتا تو اذان خطبہ ہندوستان کے مساجد میں مائک پر دی جاتی جو کہ نہیں دی جاتی ہے۔ بہر کیف اس سیاق میں فقہا کی بعض عبارتیں نقل کی جاتی ہیں اور ان سے غلط استدلالات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

البحر الرائق میں ہے:

وَفِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ، وَيَنْبَغِي لِلْمُؤَذِّنِ أَنْ يُؤَذِّنَ فِي مَوْضِعٍ يَكُونُ أَسْمَعَ

لِلْجِيرَانِ وَيَرْفَعَ صَوْتَهُ وَلَا يُجْهِدَ نَفْسَهُ؛ لِأَنَّهُ يَتَضَرَّرُ بِذَلِكَ، وَفِي الْخُلَاصَةِ: وَلَا يُؤَذِّنُ فِي الْمَسْجِدِ (۱)

''سراج وہاج'' میں ہے کہ مؤذن کے لیے بہتر ہے کہ کسی بلند جگہ پر اذان دے جس کو پڑوس میں رہنے والے لوگ بخوبی سن سکیں اور اپنی آواز بلند کرے لیکن آواز بلند کرنے میں پوری طاقت نہ جھونک دے کہ اس سے ضرر لاحق ہو اور ''خلاصہ'' میں ہے کہ مسجد میں اذان نہ دی جائے۔

''حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح'' میں ہے:

واختلف في أذان المغرب والظاهر أنه يؤذن في مكان عال أيضا كما في السراج ويكره أن يؤذن في المسجد كما في القهستاني عن النظم، فإن لم يكن ثمة مكان مرتفع للأذان يؤذن في فناء المسجد كما في الفتح (٢)

یعنی مغرب کی اذان کے بارے میں اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی کسی بلند جگہ دی جائے جیسا کہ ''سراج'' میں ہے۔ اور مسجد میں اذان دینا مکروہ ہے جیسا کہ ''نظم'' سے منقول ''قہستانی'' میں ہے اور اگر وہاں بلند جگہ نہ ہو تو صحن مسجد میں اذان دی جائے جیسا کہ ''فتح'' میں ہے۔

اسی طرح ''فتح القدیر'' میں ہے:

وَأَمَّا الْأَذَانُ فَعَلَى الْمِئْذَنَةِ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَفِي فِنَاءِ الْمَسْجِدِ وَقَالُوا لَا يُؤَذِّنُ فِي الْمَسْجِدِ (۳)

---

(۱) البحر الرائق، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/ ۲٦۸)

(۲) حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (ص: ۱۹۷/ ۱۹۸)

(۳) فتح القدیر، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/ ۲۴٦)

اذان، اذان خانے میں ہو، اگر اذان خانہ نہ ہوتو صحن مسجد میں ہواور فقہانے فرمایا ہے کہ مسجد میں اذان نہ دی جائے۔

اس قسم کی عبارتوں سے لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خطبہ کی اذان بھی مسجد میں نہ دی جائے۔ جب کہ سیاق کلام ہی سے یہ متبادر ہو رہا ہے کہ یہ پنج وقتہ اذان کے بارے میں ہے؛ کیوں کہ عبارات مذکورہ میں یہ کہا گیا ہے کہ اذان ایسی جگہ سے دی جائے کہ پڑوسیوں کو بھی سنائی دے، تاکہ وہ نماز کے لیے آسکیں اور ظاہر ہے پڑوسیوں کو بلانا پنج وقتہ نماز ہی میں ہوتا ہے یا پھر جمعہ کی اذان اول میں۔ جمعہ کی اذان ثانی میں تو سب لوگ آ ہی چکے ہوتے ہیں، لہٰذا پھر پڑوسیوں کو خبر کرنا چہ معنی دارد؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر فقہا کی عبارت کا یہی مطلب ہوتا کہ کوئی بھی اذان مسجد میں نہ دی جائے خواہ پنج وقتہ ہو یا اذان خطبہ، تو پھر یہ کیسے متصور ہوسکتا ہے کہ فقہا ایک طرف مسجد میں اذان دینے سے روک رہے ہیں اور دوسری طرف خود ہی سارے فقہا، علما اور مشائخ دوسری صدی سے لے کر اب تک مسجد میں اذان بھی دے رہے ہیں، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس حکم میں اذان خطبہ شامل نہیں ہے۔ اگر اس توضیح کو تسلیم نہ کیا جائے تو تمام فقہا، علما اور مشائخ پر فعل مکروہ کے ارتکاب کا اور قول و عمل کے تضاد کا الزام عائد ہوگا۔

مذکورہ فقہی عبارات پر ایک بار پھر غور کریں اور جو حضرات ان عبارتوں کو داخل مسجد اذان خطبہ کو روکنے کے لیے پیش کرتے ہیں وہ بھی غور کرلیں، جو لوگ داخل مسجد اذان خطبہ کو روکتے ہیں وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اذان خطبہ امام اور منبر کی سیدھ میں ٹھیک سامنے ہو، مذکورہ عبارت میں اس کا کہیں سے کہیں تک ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس مذکورہ عبارتیں یہ کہتی ہیں کہ اذان منارہ، مئذنہ، بلند جگہ اور یہ بھی نہ ہوتو صحن مسجد میں دی جائے۔ اب ان عبارتوں سے اگر اذان خطبہ پر استدلال درست ہوگا تو پھر یہ کہا جانا چاہیے

کہ اذان خطبہ مئذنہ، منارہ یا کسی بلند جگہ پر ہو، یہ نہ ہو تو صحن مسجد میں ہو، داخل مسجد میں نہ ہو، ظاہر ہے اس قسم کا استدلال کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرسکتا۔ اس سے آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہوگیا کہ اس قسم کی عبارتیں عام اذانوں سے متعلق ہیں، جن کا مقصود دور تک آواز پہنچانا ہوتا ہے، اذان خطبہ ان عبارتوں سے قطعی طور سے مستثنیٰ ہے۔

مسجد میں ذکر بالجہر کی ممانعت:

بعض حضرات مسجد کے اندر خطبہ کی اذان کو اس لیے بھی منع کرتے ہیں کہ ان کے مطابق مسجد میں ذکر بالجہر ممنوع ہے اور اذان بھی ذکر بالجہر کی ایک قسم ہے، لہٰذا اس کی بھی ممانعت ہوگی، جب کہ ایسا خیال روایت ودرایت اور علم وتحقیق کے بالکل خلاف ہے کیوں کہ مطلقاً مسجد کے اندر ذکر بالجہر کی ممانعت ہرگز نہیں ہے بلکہ مسجد میں مطلقاً ذکر سے روکنے والوں کو قرآن نے ظالم کہا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا

”اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کیے جانے سے روک دے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔“ (البقرۃ: ۱۱۴)

اس آیت کریمہ میں یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ مسجد میں اللہ کا نام ذکر کیے جانے سے روکتے ہیں وہ ظالم ہیں اور اس میں ذکر عام ہے جو ذکر جہری اور ذکر سری دونوں کو شامل ہے۔

مزید یہ کہ احادیث سے بھی ذکر بالجہر کا ثبوت ملتا ہے، ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

صحیح بخاری میں ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

إِنَّ رَفْعَ الصَّوْتِ بِالذِّكْرِ حِينَ يَنْصَرِفُ النَّاسُ مِنَ الْمَكْتُوبَةِ كَانَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: كُنْتُ أَعْلَمُ إِذَا انْصَرَفُوا بِذَلِكَ إِذَا سَمِعْتُهُ (۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلاۃ، ح: ۸۴۱)

فرض نماز سے فراغت کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں رائج تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مزید فرماتے ہیں: جب میں ذکر سنتا تب مجھے نماز کے ختم ہونے کا علم ہو جاتا۔

اس طرح کی متعدد احادیث کریمہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر ذکر بالجہر جائز ہے۔

اب میں اس حوالے سے فقہا کی عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

ردالمحتار میں ہے:

قَالَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ: إنَّ الْجَهْرَ أَفْضَلُ، لِأَنَّهُ أَكْثَرُ عَمَلًا، وَلِتَعَدِّي فَائِدَتِهِ إلَى السَّامِعِينَ، وَيُوقِظُ قَلْبَ الذَّاكِرِ فَيَجْمَعُ هَمَّهُ إلَى الْفِكْرِ، وَيَصْرِفُ سَمْعَهُ إلَيْهِ، وَيَطْرُدُ النَّوْمَ، وَيَزِيدُ النَّشَاطَ. اهـ. (۱)

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ہے کیوں کہ اس میں محنت زیادہ ہے اور اس کا فائدہ سننے والوں تک پہنچتا ہے۔ یہ ذکر کرنے والے کے دل کو بیدار کرتا ہے، اس کے خیال کو جمع کرتا ہے، کانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے، اس کی نیند بھگاتا ہے اور اس کے ذوق وشوق میں اضافہ کرتا ہے۔

ردالمحتار ہی میں ہے:

وَفِي حَاشِيَةِ الْحَمَوِيِّ عَنْ الْإِمَامِ الشَّعْرَانِيِّ: أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ سَلَفًا وَخَلَفًا عَلَى اسْتِحْبَابِ ذِكْرِ الْجَمَاعَةِ فِي الْمَسَاجِدِ وَغَيْرِهَا إلَّا أَنْ يُشَوِّشَ جَهْرُهُمْ عَلَى نَائِمٍ أَوْ مُصَلٍّ أَوْ قَارِئٍ إلَخْ (۲)

---

(۱) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا (۱/ ۶۶۰)

(۲) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا (۱/ ۶۶۰)

''حاشیۃ الحموی''میں امام شعرانی سے منقول ہے کہ سلفا،خلفا تمام علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسجد کے اندر یا دوسری جگہ اجتماعی ذکر بالجہر مستحب ہے۔ ہاں اگر اس سے سونے والے یا کسی نمازی یا کسی تلاوت کرنے والے کو خلل ہوتو پھر درست نہیں ہے۔

قرآن کریم احادیث نبویہ اور اقوال فقہا کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذکر بالجہر مسجد کے اندر جائز ہے۔ہاں اگر ذکر بالجہر سے کسی نمازی،سونے والے یا کسی قاری قرآن کو خلل ہوتو پھر ذکر بالجہر درست نہیں ہے۔

فتاوی رضویہ میں بھی اس مسئلہ کی وضاحت ہے:

''جہاں کوئی نماز پڑھتا ہو یا سوتا ہو کہ بآواز پڑھنے سے اس کی نماز یا نیند میں خلل آئے گا وہاں قرآن مجید و وظیفہ ایسی آواز سے پڑھنا منع ہے۔مسجد میں جب اکیلا تھا اور بآواز پڑھ رہا تھا جس وقت کوئی نماز کے لیے آئے فوراً آہستہ ہوجائے۔''(۱)

آپ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''درود شریف خواہ کوئی وظیفہ بآواز نہ پڑھا جائے جب کہ اس کے باعث کسی نمازی یا سوتے یا مریض کی ایذا ہو یا رِیا آنے کا اندیشہ ہو۔اور اگر کوئی محذور نہ موجود ہو، نہ مظنون تو عند التحقیق کوئی حرج نہیں،تاہم اخفا افضل ہے۔**لما فی الحدیث، خیر الذکر الخفی۔و اللہ تعالی أعلم**''(۲)

ایک اور جگہ آپ فرماتے ہیں:

حدیث صحیح میں قرآن مجید بآواز ایسی جگہ پڑھنے سے جہاں لوگ نماز پڑھ رہے ہوں ممانعت فرمائی ہے۔اور قرآن عظیم نے حکم فرمایا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے کان لگا

---

(۱) فتاوی رضویہ(۸/ ۱۰۰)

(۲) فتاوی رضویہ(۶/ ۲۳۳)

کر سنو اور چپ رہو۔تو ایسی جگہ جہر سے پڑھنا ممنوع ہے اور دو یا زیادہ آدمیوں کا بآواز پڑھنا اور شدید ممنوع کہ مخالف حکم قرآن اور قرآن عظیم کی بے حرمتی ہے۔ان لوگوں کو چاہیے کہ آہستہ پڑھیں۔اور نفل پڑھنے والے نفل سے نہیں روکے جاسکتے ہیں۔نفل نماز مستحب تلاوت سے افضل ہے کہ اس میں تلاوت بھی ہے، رکوع سجود بھی۔(۱)

فاضل بریلوی کی اس عبارت سے بھی معلوم ہو گیا کہ اگر ذکر بالجہر سے لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہو یا کسی کی نماز یا تلاوت میں خلل پڑ رہا ہو تو اس کی ممانعت ہے، ورنہ اس کی اجازت ہے۔

مذکورہ بالا حوالوں کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اذان خطبہ بھی ایک ذکر ہے جو مسجد کے اندر بلا شبہ جائز ہوگی، جیسا کہ ذکر بالجہر کی دیگر صورتیں جائز ہیں۔اس کو صرف ذکر بالجہر ہونے کی بنا پر مسجد سے خارج نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ لوگ اس سے خلل میں مبتلا نہیں ہوتے، بلکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو سماع خطبہ کے لیے آمادہ کرنا اور اوراد و وظائف اور نوافل کو موقوف کرنے کے لیے متنبہ کرنا ہی مقصود ہے، جو حاصل ہے، خواہ اذان مسجد کے اندر ہو یا باہر۔

اگر بر سبیل تنزل مان بھی لیں کہ اذان ''ذکر بالجہر'' ہے لہٰذا اس کو باہر ہی ہونا چاہیے تو ایسے لوگوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اذان مسجد کے باہر دروازہ پر دینے کی صورت میں بھی تو آواز مسجد کے اندر جائے گی، کیوں کہ یہ متصور ہی نہیں کہ اذان مسجد کے دروازہ پر ہو اور آواز اندر نہ جائے، بلکہ خطبہ کی اذان کو مسجد کے اندر پہنچانا ضروری بھی ہے تا کہ مسجد کے لوگ سماع خطبہ کے لیے تیار ہو سکیں۔

لہٰذا صرف اس بنا پر اذان خطبہ کو مسجد کے اندر دینے سے روکنا کہ مسجد میں آواز بلند

(۱) فتاوی رضویہ (۶/ ۳۳۸)

ہوگی عقلاً نقلاً دونوں لحاظ سے درست نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ شوشہ بھی چھوڑتے ہیں کہ اذان خالص ذکر نہیں ہے لہٰذا اس کو مسجد میں دینا درست نہیں، یہ بھی نا قابل فہم بات ہے، کیوں کہ کلمات اذان سب کے سب ذکر ہی پر مشتمل ہیں، کیوں کہ ان کلمات میں اللہ کی حمد وثنا، اس کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت کی گواہی اور لوگوں کو اللہ کی بارگاہ کی طرف بلانا ہی تو ہے۔ اگر صرف اس کو اس بنا پر مسجد سے خارج کر دیا جائے کہ اس میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے اور یہ ذکر نہیں ہے تو پھر مسجد سے دعوت وتبلیغ، وعظ ونصیحت، مسائل فقہ کی مشق وممارست، نکاح خوانی، صلاۃ وسلام وغیرہ کو بھی خارج کر دینا چاہیے، جب کہ یہ ساری چیزیں مسجد میں درست ہیں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اذان ذکر کے ساتھ اعلان بھی ہے تو جواب ہوگا کہ یہ مقصود بھی اذان خطبہ مسجد کے اندر دینے سے حاصل ہے، کیوں کہ داخل مسجد اذان خطبہ سے تمام حاضرین تک آواز پہنچ جاتی ہے اور اس سے مقصود حاضرین کو ہی مطلع کرنا ہے۔ اور اگر کوئی اسے غائبین کے لیے بھی اعلان سمجھتا ہے تو اسے چاہیے کہ خطبے کی اذان بھی مئذنہ میں اور مائک کے ذریعے کرائے۔

یہاں یہ بات بھی ہمارے ذہنوں میں ہونی چاہیے کہ ہم اس اذان کو خارج مسجد ہونے پر شدید اصرار کرتے ہیں کہ مسجد کے اندر آواز بلند نہ ہو اور ساتھ ہی مسجد کے اندر چیخ چیخ کر صلاۃ وسلام بھی پڑھتے ہیں، جب کہ بہت سے لوگ نماز میں مشغول ہوتے ہیں۔ میں اپنے گھر پر جہاں میں پنج وقتہ نماز ادا کرتا ہوں وہاں میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ بعد نماز فجر ہر دن کچھ لوگوں کی ایک دو رکعت نماز چھوٹ جاتی ہے، وہ لوگ اپنی رکعت بھی مکمل نہیں کر پاتے ہیں کہ ادھر امام صاحب بلند آواز صلاۃ وسلام پڑھنے لگتے ہیں۔ اب وہ بے چارے جن کی نماز چھوٹی ہوتی ہے وہ بھی جیسے تیسے نماز مکمل کر کے صلاۃ وسلام پڑھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح بعد نماز عصر اور بعد نماز جمعہ بھی ہوتا ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے آج

کل اہل سنت کے بہت سی مساجد میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں اعلی حضرت فاضل بریلوی کے ایک فتوی سے ہمیں یہی رہنمائی ملتی ہے کہ مسجد میں بالجہر درود وسلام اسی وقت پڑھنا درست ہے، جب کسی نمازی کو خلل واقع نہ ہو۔ موصوف اپنے ایک فتوی میں لکھتے ہیں:

''درود شریف ذکر ہے، ذکر بالجہر جائز ہے جبکہ نہ ریا ہو نہ کسی نمازی یا مریض یا سوتے کی ایذا، نہ کسی اور مصلحت شرعیہ کا خلاف، یوہیں درود شریف بھی جہراً جائز و مستحب ہے جس کے جواز پر دلیل اجماع، کہ قرات حدیث و ذکر نام اقدس میں سلفا خلفا تمام ائمہ وعلماو مسلمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسی آواز سے کہتے ہیں جتنی آواز سے قرأت حدیث وکلام کررہے ہیں اور یہ جہر ہے۔ **واللہ تعالی أعلم**''(۱)

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ محض ''**حی علی الصلاۃ یاحی علی الفلاح**'' جیسے الفاظ کی وجہ سے اذان کو مسجد سے باہر کیے جانے پر اصرار ہے جب کہ ان کلمات سے خیر کی دعوت مقصود ہے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسے لوگوں کے نزدیک ان مشاعروں اور محفلوں کے مسجد کے اندر ہونے کا جواز کس طرح ہوگا جو ہر دوسرے دن مسجد میں منعقد ہوتی ہیں، نذرانوں پر آنے والے خطبا اور شعرا کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جسے نہ دین پر عمل سے مطلب ہے نہ دین کی صالح دعوت اور معاشرے کی اصلاح سے غرض، لفظوں کی بازی گری ،مقابلہ آرائی، اپنے حریفوں کی ہجو گوئی اور بے ہنگم چیخ پکار اور نعرہ وغوغا سے مسجد کی در و دیوار کو ہلا ڈالنے کی سعی نامشکور، یہ کون سا ذکر خالص اور ذکر صالح ہے جس کے لیے ہماری پیشانیوں پر بل نہیں پڑتے اور جب مسجد کے اندر اذان خطبہ ہوجائے تو مسجد کا تقدس پامال ہوجاتا ہے ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

---

(۱) فتاوی رضویہ (۶/ ۲۳۴)

مسئلۂ اقامت کی شرعی حیثیت

پچھلی کئی دہائیوں سے بالخصوص جماعت اہل سنت کے درمیان یہ فتنہ ظہور پذیر ہوا کہ فرائض وواجبات کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی اور مستحبات ومباحات پر اس قدر سختی کی جاتی ہے کہ انھیں ضروریات دین یا ضروریات اہل سنت کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور پھر انھیں مسلک کا نشان امتیاز قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس سے بھی اپنی ہوس کی پیاس نہیں بجھتی تو سادہ لوح مسلمانوں پر بدعت وگمرہی کا جبری حکم لگا دیا جاتا ہے اور ظلم وتشدد کے پہاڑ ڈھائے جانے لگتے ہیں۔

اس حوالے سے جب ہم ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو اہل سنت کے یہاں اس طرح کی مثال کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ آج ہمارے دور کا یہ سب سے بڑا فتنہ ہے جس سے ہم سب دوچار ہیں، حالاں کہ شریعت مطہرہ کے اندر احکام شرع کی درجہ بندی کی گئی ہے اور اسی درجہ کے مطابق بندے کو احکام کا مکلف بھی بنایا گیا ہے۔

ہمارے فقہائے کرام نے اس درجہ بندی کی توضیح وتنقیح اور تعریف کر کے احکام شرع کو مکمل طور سے واضح کر دیا ہے۔ متقدمین فقہا نے احکام شرع کو پانچ قسموں میں منقسم کیا ہے اور بعد کے فقہا نے ان کو سات قسموں میں بانٹا ہے، بعد میں اس میں اور اضافہ ہوا اور نو قسموں تک پہنچا دیا گیا۔ پھر اس میں اور وسعت دی گئی اور احکام شرع کو گیارہ قسموں تک پہنچایا گیا اور وہ یہ ہیں:

فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، مستحب، حرام، مکروہ تحریمی،

اساءت،مکروہ تنزیہی،خلاف اولی اور مباح

ان تمام کی تعریفات اور احکامات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔اگر ہم ان احکامات کے مطابق عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارے ماحول میں پیدا بہت ساری فتنہ سامانیاں اور نفرتیں خود بخود ختم ہو جائیں گی،لیکن ہمارا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کی بات سننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتے، بلکہ اپنی ہی بات کو قولا نہ سہی عملا ''وحی'' کا درجہ دے دیتے ہیں، اور اس کے خلاف کرنے والے کو کافر و مشرک اور بدعتی و گمراہ تک بنا دیتے ہیں۔

سردست دونوں مسئلوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اذان و اقامت دونوں مسئلے فرعی و استحبابی ہیں۔پہلے مسئلے کی پوری نوعیت واضح کی جا چکی ہے۔

اب رہا مسئلۂ اقامت تو یہ مسئلہ بھی تمام فقہا کے نزدیک استحباب اور عدم استحباب سے تعلق رکھتا ہے۔

درمختار میں ہے:

(وَلَهَا آدَابٌ) تَرْكُهُ لَا يُوجِبُ إسَاءَةً وَلَا عِتَابًا كَتَرْكِ سُنَّةِ الزَّوَائِدِ، لَكِنَّ فِعْلَهُ أَفْضَلُ (نَظَرُهُ إلَى مَوْضِعِ سُجُودِهِ حَالَ قِيَامِهِ، وَإِلَى ظَهْرِ قَدَمَيْهِ حَالَ رُكُوعِهِ ...(وَالْقِيَامُ) لِإِمَامٍ وَمُؤْتَمٍّ (حِينَ قِيلَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ) (۱)

نماز کے چند آداب ہیں،جن کا ترک نہ ''اساءت'' کا موجب ہے اور نہ کسی ''عتاب'' کا۔ان آداب کا چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ''سنن زوائد'' کا چھوڑ دینا،لیکن ان کا کرنا افضل ہے،جیسے نماز میں قیام کی حالت میں سجدہ گاہ پر نظر رکھنا اور رکوع کی حالت میں قدم کی پشت کو دیکھنا،وغیرہ...ان ہی آداب میں سے امام اور مقتدی کا حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا بھی ہے۔

---

(۱)الدر المختار مع شرحہ،کتاب الصلاۃ،باب صفۃ الصلاۃ(۱/۴۷۷-۴۷۹)

علامہ حسن بن عمار بن علی وفائی شرنبلالی علیہ الرحمہ (١٠٦٩ھ) نے بھی اپنی کتاب ''نورالایضاح'' میں اس مسئلہ کو آداب نماز میں سے شمار کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

فصل في آداب الصلاة... من آدابها... والقيام حين قيل حي على الفلاح وشروع الإمام مذ قيل قد قامت الصلاة (١)

نماز کے آداب میں سے یہ ہے کہ **حی علی الفلاح** پر کھڑا ہو اور **قد قامت الصلاة** پر نماز شروع کردے۔

علامہ امجد علی اعظمی نے بھی ''بہار شریعت'' میں اس مسئلے کو مستحبات میں سے شمار کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

جب مکبر **حی علی الصلاة** کہے تو امام ومقتدی سب کا کھڑا ہونا... جب مکبر **قد قامت الصلاة** کہہ لے تو نماز شروع کرسکتا ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ اقامت پوری ہونے پر شروع کرے۔ (٢)

علامہ موصوف نے مستحب کی یہ تعریف کی ہے:

ہر وہ شئ جو نظر شرع میں پسند ہو مگر ترک پر کچھ ناپسندی نہ ہو، خواہ خود حضور اقدس ﷺ نے اسے کیا یا اس کی ترغیب دی یا علمائے کرام نے پسند فرمایا، اگرچہ احادیث میں اس کا ذکر نہ آیا، اس کا کرنا ثواب اور نہ کرنے پر مطلقا کچھ نہیں۔ (٣)

خلاصہ یہ کہ صاحب درمختار کا اس مسئلہ کو سنن زوائد کی مثل بتانا اور علامہ امجد علی اعظمی کا اس کو مستحبات میں سے شمار کرکے ''مستحب'' کی تعریف میں یہ کہنا کہ ''نظر شرع میں

---

(١) نورالایضاح، کتاب الصلاۃ، فصل فی آداب الصلاۃ (ص: ٥٩)

(٢) بہار شریعت، جلد اول حصہ سوم، ص: ٥٣٨

(٣) بہار شریعت، جلد اول، حصہ دوم، ص: ٢٨٣

پسند ہومگر ترک پر کچھ ناپسندی نہ ہو...اس کا کرنا ثواب اور نہ کرنے پر مطلقا کچھ نہیں' اس کی حیثیت اور نوعیت کو واضح کرتا ہے۔اب اس کے باوجود اس کے تارک پر لعن طعن کرنا، اس کے ساتھ دست وگریباں ہونا، اس کو بے ادب اور گستاخ تک کہہ دینا اور اس فرعی مسئلے کو بنیاد بنا کر کسی بھی خانقاہ یا شخصیت کو بدنام کرنا، ان سے قطع تعلق روا رکھنا اور جماعت اہل سنت میں انتشار کو ہوا دینا کسی بھی باشعور اور دین وسنیت کے ہمدرد کے نزدیک اصولی اور فکری ہر اعتبار سے روا نہیں بلکہ اجتماعیت کو تار تار کرنا اور امت مسلمہ کے شیرازہ کو بکھیرنا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کے جان وایمان پہ لالے پڑے ہیں۔اس طرح کی باتیں کرنا لاشعوری طور پر غیروں کا ساتھ دینا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا ہے۔العیاذ باللہ!

اس حوالے سے ماضی قریب کے زبردست محقق علامہ غلام رسول سعیدی نے نہایت معتدل رائے کا اظہار کیا ہے، آپ رقم طراز ہیں: **حی علی الصلاۃ** پر کھڑا ہونا مستحب ہے، اس لئے اس سے پہلے کھڑا ہونا مستحب کے خلاف ہے، اور حاشیہ طحطاوی اور اسی طرح عالم گیری میں جو اس کو مکروہ لکھا ہے اس سے مراد مکروہ تنزیہی ہے اور دراصل یہ خلاف اولی ہے۔اور قاعدہ یہ ہے کہ مستحب کے ترک پر ملامت نہیں کی جاتی، اس لیے جو لوگ اقامت کے وقت پہلے سے کھڑے ہو جائیں ان کو ملامت نہیں کرنا چاہیے اور مستحب کے ساتھ واجب کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ کسی مستحب کو ترک کرنے میں اتنی قباحت نہیں، جتنی کسی مستحب کو واجب قرار دینے میں قباحت ہے، اور کچھ لوگ **حی علی الفلاح** پر اٹھنے والوں کو ملامت کریں کہ یہ دیر سے اٹھتے ہیں اور ان کو اقامت کی ابتدا میں کھڑا ہونا چاہیے تھا تو یہ اور زیادہ مذموم ہے۔(۱)

---

(۱) شرح صحیح مسلم، ۱/۱۱۰۱)

مسئلۂ اقامت: احادیث کی روشنی میں

احکام کے باب میں مسئلہ اقامت کی نوعیت وحیثیت کے واضح ہوجانے کے بعد اب ہم احادیث نبویہ کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس مسئلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یا ارشاد کیا رہا ہے۔اس باب میں تین طرح کی روایتیں موجود ہیں:

(۱)ابتدائے اقامت سے پہلے

(۲) وسط اقامت یعنی قد قامت الصلاۃ کے وقت

(۳)اختتام کے بعد

ذیل میں ان مختلف روایات کونقل کیا جاتا ہے۔پھر شارحین حدیث کے حوالے سے ان روایات کے مطالب ومقاصد،جمع وتطبیق اورتشریحات پربھی اجمال کے ساتھ گفتگوقلم بند کی جائے گی،تاکہ احادیث کی روشنی میں مسئلۂ اقامت کی اصل حیثیت سامنے آسکے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَقُمْنَا، فَعَدَّلْنَا الصُّفُوفَ، قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ فَأَتَى رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حَتَّى إِذَا قَامَ فِي مُصَلَّاهُ قَبْلَ أَنْ يُكَبِّرَ، ذَكَرَ فَانْصَرَفَ، وَقَالَ لَنَا: مَكَانَكُمْ، فَلَمْ نَزَلْ قِيَامًا نَنْتَظِرُهُ حَتَّى خَرَجَ إِلَيْنَا، وَقَدِ اغْتَسَلَ يَنْطُفُ رَأْسُهُ مَاءً، فَكَبَّرَ فَصَلَّى بِنَا"(۱)

نماز کی اقامت کہی گئی اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ، ح:۶۰۵)

کھڑے ہوکر صفیں برابر کرنی شروع کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور اپنے مصلے پر کھڑے ہو گئے، تکبیر کہنے سے پہلے آپ کو غسل کرنا یاد آیا، آپ لوٹ گئے اور ہم سے فرمایا: اپنی اپنی جگہ لیے رہو، ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں کھڑے رہے، حتی کہ آپ تشریف لائے۔ اس وقت آپ کے سر اقدس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، پھر آپ نے تکبیر کہہ کر ہم کو نماز پڑھائی۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے سے قبل ہی اقامت کہہ دی گئی تھی اور صحابہ کھڑے ہو کر اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے چکے تھے۔

صحیح مسلم ہی کی ایک روایت یہ ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ تُقَامُ لِرَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَيَأْخُذُ النَّاسُ مَصَافَّهُمْ، قَبْلَ أَنْ يَقُومَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَقَامَهُ (١)

نماز کی اقامت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری پر کہی جاتی تھی اور لوگ آپ کے مصلی پر کھڑے ہونے سے پہلے اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے لیتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے پر اقامت کہی جاتی تھی، اور اقامت ہوتے ہی لوگ اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے لیتے تھے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مصلی پر کھڑے ہوتے اور نماز پڑھاتے تھے۔

ایک حدیث حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

كَانَ بِلَالٌ يُؤَذِّنُ إِذَا دَحَضَتْ، فَلَا يُقِيمُ حَتَّى يَخْرُجَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَإِذَا خَرَجَ أَقَامَ الصَّلَاةَ حِينَ يَرَاهُ (٢)

---

(١) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ، ح:٦٠٥)

(٢) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ، ح:٦٠٦)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ آفتاب ڈھلنے کے بعد اذان کہتے تھے، اور اقامت اس وقت تک نہیں کہتے تھے جب تک حضور کو تشریف لاتے نہ دیکھ لیتے۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اقامت آپ کے آنے کے بعد ہی کہی جاتی تھی۔

امام بزار اپنی ''مسند'' میں، اور امام ہیثمی ''مجمع الزوائد'' میں سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

كَانَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم إِذَا قَالَ بِلَالٌ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ نَهَضَ فَكَبَّرَ (١)

جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ اقامت میں ''قد قامت الصلاۃ'' کہنے لگتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر اللہ اکبر کہتے۔

امام عبدالرزاق حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، آپ فرماتی ہیں:

إِنَّ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم: كَانَ فِي بَيْتِهَا فَسَمِعَ الْمُؤَذِّنَ فَقَالَ كَمَا يَقُولُ: فَلَمَّا قَالَ: حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، نَهَضَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم إِلَى الصَّلَاةِ (٢)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تھے، موذن نے اقامت کہنا شروع کیا اور جب حی علی الصلاۃ کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت اپنے حجرے میں ہوتے اسی وقت اقامت ہو جاتی تھی۔

اور ترمذی کی حدیث ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كَانَ مُؤَذِّنُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُمْهِلُ فَلَا يُقِيمُ، حَتَّى إِذَا رَأَى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ خَرَجَ أَقَامَ الصَّلَاةَ حِينَ يَرَاهُ (٣)

---

(١) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، کتاب الصلاۃ، باب ما یفعل اذا اقیمت الصلاۃ ح: ١٩٢٠) مسند البزار، ح: ٣٣١٧)

(٢) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب الرجل متی یقوم للصلاۃ اذا سمع الاذان، ح: ١٨٥١) طبرانی/المعجم الکبیر (١٧/ ٨٠)

(٣) سنن الترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ما جاء ان الامام احق بالاقامۃ، ح: ٢٠٢)

رسول اللہ ﷺ کے مکبر تکبیر کہنے میں تاخیر کرتے تھے اور اس وقت تک اقامت نہیں کہتے جب تک آپ کو دیکھ نہ لیتے جب دیکھتے اس وقت اقامت کہتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے، حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ، فَلاَ تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي (١)

جب اقامت کہی جائے تو اس وقت تک مت کھڑے ہو جب تک مجھے نہ دیکھ لو۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو دیکھنے سے پہلے کھڑا ہونا منع ہے اور آپ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جانا ہے، خواہ تکبیر شروع ہوتے ہی حضور کو دیکھ لیا جائے یا حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح یا ختم تکبیر پر حضور کو دیکھا جائے، ہر صورت میں کھڑا ہونا جائز ہے

ان احادیث کے درمیان بظاہر تضاد نظر آتا ہے، اس تضاد کو امام نووی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدرالدین عینی نے ختم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

امام محی الدین نووی (٦٧٦ھ) لکھتے ہیں:

يُجمَع بَيْن مُخْتَلَف هَذِهِ الْأَحَادِيث بِأَنَّ بِلَالًا - رضی اللہ عنہ - كَانَ يُرَاقِبُ خُرُوجَ النَّبِيّ ﷺ مِنْ حَيْثُ لَا يَرَاهُ غَيْره أَوْ إِلَّا الْقَلِيل، فَعِنْد أَوَّل خُرُوجه يُقِيم، وَلَا يَقُوم النَّاس حَتَّى يَرَوْهُ، ثُمَّ لَا يَقُوم مَقَامه حَتَّى يَعْدِلُوا الصُّفُوف. وَقَوْله فِي رِوَايَة أَبِي هُرَيْرَة رضی اللہ عنہ: (فَيَأْخُذ النَّاس مَصَافّهمْ قَبْل خُرُوجه). لَعَلَّهُ كَانَ مَرَّة أَوْ مَرَّتَيْنِ، وَنَحْوهمَا، لِبَيَانِ الْجَوَاز أَوْ لِعُذْرٍ، وَلَعَلَّ قَوْله ﷺ (فَلَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي) كَانَ بَعْد ذَلِكَ، قَالَ الْعُلَمَاء: وَالنَّهْي عَنْ الْقِيَام قَبْل أَنْ يَرَوْهُ لِئَلَّا يَطُول عَلَيْهِمْ الْقِيَام، وَلِأَنَّهُ قَدْ يَعْرِض لَهُ عَارِض فَيَتَأَخَّر بِسَبَبِهِ. (٢)

---

(١) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب: متی یقوم الناس، اذا رأوا الامام عند الاقامۃ، ح: ٦٣٧)

(٢) شرح النووی علی مسلم، کتاب الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ (٥ / ١٠٣)

ان تمام مختلف احادیث کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد پر نظر گڑائے رہتے تھے، اس لیے صرف حضرت بلال یا ان کے علاوہ کچھ لوگ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکلتے دیکھ پاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکلتے ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ اقامت شروع کر دیتے تھے اور صحابہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے صفیں درست کراتے اور اس کے بعد اپنے مصلے پر تشریف لے جاتے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو یہ ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکلنے سے پہلے ہی اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے لیتے تھے، تو ہوسکتا ہے کہ یہ ایک یا دو مرتبہ کا واقعہ ہو، یا بیان جواز کے لیے ہو یا کسی عذر کی بنا پر ایسا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''مت کھڑے ہو یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو'' اس واقعہ کے بعد کا ہو۔ علما نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنے سے پہلے کھڑے ہونے کی ممانعت اس لیے تھی تاکہ لوگوں پر قیام طویل نہ ہو جائے اور اس لیے بھی کہ ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی عارضہ پیش آجائے جس کی وجہ سے نکلنے میں تاخیر ہو جائے۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی مصری (۸۵۵ھ) نے بھی عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (۸ / ۲۱۲) میں یہی توضیح و تطبیق ان ہی الفاظ سے فرمائی ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی ''فتح الباری'' میں ایک واضح توضیح اس طرح لکھتے ہیں:

لَا تَقُومُوا: نَهْيٌ عَنْ الْقِيَامِ، وَقَوْلُه: "حَتَّى تَرَوْنِي" تَسْوِيغٌ لِلْقِيَامِ عِنْدَ الرُّؤْيَةِ، وَهُوَ مُطْلَقٌ غَيْرُ مُقَيَّدٍ بِشَيْءٍ مِنْ أَلْفَاظِ الْإِقَامَةِ

لاتقوموا کے ذریعہ قیام سے منع کیا گیا ہے، جب کہ دیکھنے کے بعد قیام کی اجازت دی گئی ہے اور یہ اجازت مطلق ہے، اقامت کے کسی مخصوص کلمہ پر اس حکم کو مقید نہیں کیا گیا ہے۔(۱)

---

(۱) فتح الباری، ابن حجر (۲ / ۱۱۹)

مذکورہ بالا احادیث کریمہ اور محدثین کی تشریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دین میں اقامت کے وقت کھڑے ہونے کا کوئی متعین وقت مقرر نہیں ہے اور نہ ہی کلمات اقامت میں سے کسی کلمے کی ایسی تحدید کی گئی ہے کہ اس کلمے پر ہی کھڑا ہونا ضروری ہے، البتہ بعض دفعہ صحابہ کرام حضور کے تشریف لانے سے پہلے ہی کھڑے ہوگئے اور اپنی اپنی صفیں درست کرلیں تو اس کا جواب محدثین نے یہ دیا ہے کہ یہ جواز کی صورت ہے یا کسی عذر کی بنا پر ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ کبھی کبھی ایسا بھی کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث وتشریحات سے یہ بھی واضح ہوا کہ عہد رسالت میں اذان کا وقت متعین تھا، اقامت کا وقت متعین نہیں تھا، اقامت اس وقت ہوتی جب سرکار علیہ السلام مسجد میں تشریف لے آتے۔ آپ کو دیکھ کر ہی حضرت بلال اقامت شروع کرتے اور آپ کو دیکھنے کے بعد ہی صحابہ کھڑے ہوتے اور حضرت بلال کے دیکھنے اور صحابہ کے دیکھنے میں کتنے لمحات کا فاصلہ ہوتا ہوگا، اس کا تصور کیا جاسکتا ہے اور اسی سے مکبر اور مقتدیوں کے کھڑے ہونے کا مسنون وقت بھی معلوم کیا جاسکتا ہے، اصل سنت اور دائمی سنت یہی ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ وقتی یا کسی علت کے سبب ہے، جیسا کہ تشریحات کے ضمن میں مذکور ہوا۔ یہ بھی ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ سرکار علیہ السلام حجرے میں ہوتے، مسجد میں نہ ہوتے۔ آپ کا معمول یہی تھا۔ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں فقہا کی جزئیات اور تفریعات دیکھنے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو یہ اصل سنت اور معمول ہے وہ ہمارے ذہنوں سے محو نہیں ہونا چاہیے۔

مذکورہ روایات وتشریحات کی روشنی میں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حدیث میں ابتدا سے کھڑے ہونے کی ممانعت صرف اس صورت میں ہے جب امام مسجد میں نہ ہو اور مقتدی امام کے انتظار میں کھڑے ہوجائیں، جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا کہ صحابہ کرام حضور کے

تشریف لانے سے پہلے ہی کھڑے ہوجاتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ جب تک مجھے دیکھ نہ لو اس وقت تک کھڑے مت ہوا کرو۔ اس ممانعت کی وجہ محدثین یہ بتاتے ہیں کہ تا کہ ان کو دیر تک کھڑے ہونے کی مشقت نہ اٹھانی پڑے، گویا یہ منعِ تکریم و تسہیل ہوا نہ کہ منع تحریم، یعنی ایسا نہیں کہ صحابہ کوئی ناجائز و حرام کام کرتے تھے جس سے آپ نے روکا بلکہ وہ یک گونا مشقت میں پڑ رہے تھے، اس لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے از راہ شفقت منع فرما دیا۔

خلاصہ یہ کہ حدیث کی رو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقتدی کا امام کے انتظار میں کھڑا ہونا منع ہے، وہ بھی اس لیے تا کہ اسے دیر تک انتظار کی مشقت نہ اُٹھانی پڑے، وہ بھی منع حرمت کے لیے نہیں بلکہ منع محبت کے لیے ہے، اس کے علاوہ کسی اور صورت میں مقتدیوں کے لیے کھڑے ہونے کی ممانعت حدیث میں مذکور نہیں، بلکہ صحابہ کرام کی محبت اور بارگاہ نبوی کے آداب کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا ہی اولیٰ ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ احادیث میں یہ صراحت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لاتقوموا حتی ترونی** مجھے دیکھنے سے قبل کھڑا مت ہوا کرو۔ اب سوال ہے کہ صحابہ کا عام معمول اقامت کہنے کا کیا رہا ہوگا۔ بعض روایتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکلنے سے پہلے ہی صحابہ اقامت کہہ دیتے اور کھڑے بھی ہو جایا کرتے لیکن شارحین حدیث نے فرمایا کہ ایسا ایک دو دفعہ ہوا ہوگا، عام معمول یہ تھا کہ حضرت بلال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد پر نظر گڑائے رہتے تھے اور جوں ہی آپ کی آمد کی آہٹ محسوس کرتے تکبیر شروع کر دیتے غالباً حجرۂ اقدس جو مسجد سے متصل تھا اس کا پردہ جوں ہی ہلتا ہوگا یا اور کسی طرح سے حضرت بلال محسوس کرتے ہوں گے کہ سرکار نکل رہے ہیں فوراً اقامت شروع کر دیتے رہے ہوں گے، سرکار جوں ہی مسجد میں قدم رکھتے سارے صحابہ کھڑے ہوجاتے اس عمل میں حضرت بلال اور دوسرے صحابہ کے کھڑے ہونے میں بمشکل چند ثانیے کا فرق

ہوتا ہوگا۔ یہ نہیں کہ حضور آ کر کھڑے رہتے ہوں گے اور صحابہ بیٹھے رہتے ہوں گے **حی علی الصلاۃ** یا **قد قامت الصلاۃ** پر سب کھڑے ہوتے ہوں گے۔ روایتوں پر نظر کرنے سے یہی واضح ہوتا ہے کہ سرکار کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جاتے سرکار صفوں کو درست کراتے اور جب صفیں سیدھی ہو جاتیں تب اپنے مصلی پر پہنچتے اور نماز شروع کرتے۔ یہاں یہ گمان غلط اور احترام رسالت کے منافی ہے کہ مذکورہ روایتوں کو رد کرتے ہوئے کوئی یہ کہے کہ صحابہ حضور کے نکلنے سے پہلے از خود اقامت شروع کر دیتے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **حی علی الصلاۃ** پر باہر آتے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے سے پہلے تکبیر کہنا ایک طرح سے نبی دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھر سے باہر نکلنے کی کے لیے آواز دینا ہے جس کی صحابہ سے توقع نہیں کی جا سکتی، یہ قرآن کے مطابق آداب بارگاہ نبوی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ. وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (حجرات: ۴، ۵)

جو لوگ آپ کو گھر کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں سے اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے۔ اگر وہ لوگ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ہی باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر تھا، اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس کی مزید تائید ان روایتوں سے بھی ہوتی ہے جن کے مطابق کبھی کبھی صحابہ انتظار کر کے تھک جاتے، یہاں تک کہ بعض سونے لگتے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَظِرُونَ الْعِشَاءَ الْآخِرَةَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُءُوسُهُمْ، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلَا يَتَوَضَّئُونَ (۱)

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الطهارة، باب فی الوضوء من النوم، ح: ۲۰۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب عشا کا انتظار کرتے تھے، تو [انتظار طویل ہو جانے کی صورت میں] بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کے سر اوندھ جاتے تھے، پھر بغیر وضو کے ہی نماز ادا کر لیتے تھے۔

ایک دوسری روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا:

أَخَّرَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم صَلَاةَ الْعِشَاءِ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَإِذَا النَّاسُ يَنْتَظِرُونَ الصَّلَاةَ، قَالَ: " أَمَا إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِ هَذِهِ الْأَدْيَانِ أَحَدٌ يَذْكُرُ اللهَ هَذِهِ السَّاعَةَ غَيْرُكُمْ "(۱)

ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عشا کی نماز مؤخر فرما دی، پھر جب آپ مسجد پہنچے تو دیکھا کہ لوگ نماز کا انتظار کر رہے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دینِ خدا کو ماننے والوں میں سے کوئی اس وقت تمہارے علاوہ اللہ کو یاد نہیں کر رہا ہے۔

لہٰذا جن حدیثوں میں یہ آیا ہے کہ مکبر نے حی علی الصلاۃ کہا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے آئے، یہ اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو ترمذی کے حوالے سے گزری، صحابہ کے ادب کے خلاف بھی ہے اور قرآن کے منشا کے بھی خلاف ہے، محدثین نے اس کی توضیح بھی کر دی کہ ایسا ایک یا دو بار ہوا ہوگا، یہاں یہ بات بھی سراسر وسوسہ ہے اگر کوئی یہ سوچے کہ آپ خود سے حجرہ سے نکل کر مسجد میں آکر مصلی پر بیٹھ جاتے اور پھر حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہوتے تھے کیوں کہ یہ آپ سے نہ ثابت ہے اور نہ عقلاً بیٹھنے کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ صحیح روایتیں اس وسوسے کی تکذیب کرتی ہیں، اس لیے یہ وسوسہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

---

(۱) مسند احمد، ح: ۳۷۶۰ (۶/ ۳۰۴)

مسئلہ اقامت اور صحابہ وتابعین کا عمل

اب ہم اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں صحابہ وتابعین کے معمولات کا جائزہ لیتے ہیں، تاکہ عہد رسالت کے بعد زیر بحث مسئلے کے تعلق سے امت کا تعامل کیا تھا، وہ سامنے آسکے۔ لیکن یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب ہر بات کو ان کا معمول نہیں کہہ سکتے؛ کیوں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ حضرات کوئی عمل کسی مصلحت کی بنا پر انجام دے دیتے ہیں حالانکہ وہ ان کا معمول نہیں ہوتا۔ اسی طرح بسا اوقات ان سے کوئی روایت منقول ہوتی ہے جب کہ وہ ان کا مذہب نہیں ہوتا۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہم صحابہ اور تابعین کے معمولات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں صحابہ اور تابعین سے تین طرح کی روایتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا استحباب

(۲) ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت

(۳) ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا وجوب

قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا استحباب:

حضرت ابن المبارک حضرت ابویعلی سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

رَأَیتُ أَنَسَ بنَ مَالِکٍ إِذَا قِیلَ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ قام فوثب (۱)

---

(۱) ابن عبد البر، الاستذکار، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی النداء للصلاۃ (۱/ ۳۹۱)

میں نے حضرت انس کو دیکھا کہ جب **قد قامت الصلاۃ** کہا گیا تو آپ فورًا کھڑے ہو گئے۔

امام عبدالرزاق اپنی سند سے امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

أَقَامَ الْمُؤَذِّنُ بِالصَّلَاةِ، فَلَمَّا قَالَ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَامَ حُسَيْنٌ (۱)

مؤذن نے نماز کے لیے اقامت کہی تو جب وہ **قد قامت الصلاۃ** کہنے لگا تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔

امام عبدالرزاق لکھتے ہیں:

عَنْ عَطِيَّةَ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ ابْنِ عُمَرَ فَلَمَّا أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْإِقَامَةِ قُمْنَا، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: "اجْلِسُوا فَإِذَا قَالَ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ فَقُومُوا" (۲)

حضرت عطیہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے تھے، جب موذن نے اقامت کہنا شروع کیا، تو ہم لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیٹھ جاؤ، جب موذن **قد قامت الصلاۃ** کہنے لگے تب کھڑے ہونا۔

ان روایات سے حضرت انس، حضرت امام حسین اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا پسندیدہ عمل قد قامت الصلاۃ پر کھڑا ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی ممانعت صرف حضرت ابن عمر کی روایت سے سمجھ میں آتی ہے جس کی کوئی خاص وجہ رہی ہوگی، ورنہ اصلاً اس کی ممانعت شرع سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ اقامت کے وقت جلدی کھڑا ہونا یہ **تعجیل من الصلاۃ** کی قبیل سے ہے اور **تعجیل من الصلاۃ** سے روکنا

---

(۱) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب قیام الناس عندالاقامۃ، ح: ۱۹۳۷)

(۲) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب قیام الناس عندالاقامۃ، ح: ۱۹۴۰)

شرع میں غیر معقول ہے۔

ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت:

مصنف عبدالرزاق میں ہے، حضرت معاویہ ابن قرۃ (۱۱۳ھ) فرماتے ہیں:

كَانُوا يَكْرَهُونَ أَنْ يَنْهَضَ الرَّجُلُ إِلَى الصَّلَاةِ حِينَ يَأْخُذُ الْمُؤَذِّنُ فِي إِقَامَتِهِ(۱) لوگ مکروہ جانتے تھے کہ موذن کے اقامت شروع کرتے ہی آدمی نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

امام ابن عبد البر نے ''الاستذکار'' میں حضرت حسن بصری اور حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ:

أَنَّهُمَا كَانَا يَكْرَهَانِ أَنْ يَقُومَا حَتَّى يَقُولَ الْمُؤَذِّنُ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ(۲)

یہ دونوں حضرات ''قد قامت الصلاۃ'' سے پہلے کھڑے ہونے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

واضح رہے کہ ان لوگوں کا ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت کا قول کرنا امام کی عدم موجودگی میں ہے جیسا کہ حدیث میں گزر گیا، ورنہ امام کی موجودگی میں ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت کا قول کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ الا یہ کہ اٹھنے میں مقتدی امام پر سبقت کریں تو اس میں یک گونہ امام کی عدم متابعت ہے، جو غیر مناسب ہے۔

ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا وجوب:

امام ابن عبد البر کی ''الاستذکار'' میں ہے، حضرت عمر بن مہاجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: **إِذَا سَمِعْتَ النِّدَاءَ بِالْإِقَامَةِ فَكُنْ أَوَّلَ مَنْ أَجَابَ**(۳)

---

(۱) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب الرجل متی یقوم للصلاۃ اذا سمع الاذان، ح:۱۸۵۰)

(۲) ابن عبد البر، الاستذکار، کتاب الصلاۃ: باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۹۱)

(۳) ابن عبد البر/ الاستذکار، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۶۷)

جب تم اقامت کی ندا سنو تو سب سے پہلے اس کی بجا آوری کرنے والے بنو۔عمر بن مہاجر مزید فرماتے ہیں:

رَأَيْتُ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَمُحَمَّدَ بْنَ كَعْبٍ الْقُرَظِيَّ وَسَالِمَ بْنَ عَبْدِ اللهِ وَأَبَا قِلَابَةَ وَعِرَاكَ بْنَ مَالِكٍ الْغِفَارِيَّ وَمُحَمَّدَ بْنَ مُسْلِمٍ الزُّهْرِيَّ وَسُلَيْمَانَ بْنَ حَبِيبٍ يَقُومُونَ إِلَى الصَّلَاةِ فِي أَوَّلِ بَدْءِ الْإِقَامَةِ(۱)

میں نے دیکھا کہ عمر بن عبدالعزیز،سالم بن عبداللہ،ابوقلابہ،عراک بن مالک غفاری، محمد بن قرظی اور امام زہری اقامت شروع ہوتے ہی نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔

علامہ محمد بن ابراہیم بن منذر نیشاپوری (۲۴۲-۳۱۹ھ) جو ایک زبردست مجتہد اور فقیہ ہیں،آپ کی متعدد مایہ ناز تصانیف ہیں، ان ہی میں سے ایک ''الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف'' ہے،جس میں آپ فرماتے ہیں:

وَكَانَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، وَمُحَمَّدُ بْنُ كَعْبٍ الْقُرَظِيُّ، وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَبُو قِلَابَةَ، وَعِرَاكُ بْنُ مَالِكٍ، وَالزُّهْرِيُّ، وَسُلَيْمَانُ بْنُ حَبِيبٍ الْمُحَارِبِيُّ يَقُومُونَ إِلَى الصَّلَاةِ فِي أَوَّلِ بَدْئِهِ مِنَ الْإِقَامَةِ. وَبِهِ قَالَ عَطَاءٌ وَهُوَ مَذْهَبُ أَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ إِذَا كَانَ الْإِمَامُ فِي الْمَسْجِدِ، (۲)

عمر بن عبدالعزیز،سالم بن عبداللہ،ابوقلابہ،عراک بن مالک غفاری،محمد بن کعب قرظی اور امام زہری اقامت شروع ہوتے ہی نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے۔یہی امام عطا بن یسار،احمد بن حنبل اور اسحاق بن راھویہ کا مذہب ہے اور یہ اس صورت میں ہے جب امام مسجد میں موجود ہو۔

---

(۱)ابن عبدالبر/الاستذکار،کتاب الصلاۃ:باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۹۱)

(۲)الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف،کتاب الامامۃ (۴/۱۶۶،ح:۱۹۵۸)

ابن حجر عسقلانی نے ''فتح الباری'' میں، بدر الدین عینی حنفی نے ''عمدۃ القاری'' میں، ابن عبدالبر نے ''الاستذکار'' میں، قاضی عیاض نے ''اکمال المعلم بفوائد المسلم'' میں اور ابن ملقن نے ''التوضیح لشرح الجامع الصحیح'' میں حضرت سعید بن مسیب اور عمر بن عبدالعزیز کا یہ مذہب بیان کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اللهُ أَكْبَرُ وَجَبَ الْقِيَامُ وَإِذَا قَالَ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ عُدِّلَتِ الصُّفُوفُ وَإِذَا قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ كَبَّرَ الْإِمَامُ

جب مکبر ''اللہ اکبر'' کہے اس وقت نماز کے لیے کھڑا ہونا واجب ہے اور جب حی علی الصلاۃ کہے، اس وقت صفیں درست کر لی جائیں اور جب ''لا الہ الا اللہ کہے'' اس وقت امام نماز کے لیے تکبیر کہہ دے۔(۱)

ان تمام روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں صحابہ اور تابعین کا عمل مختلف ہے، بہت سے افراد کا معمول قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا ہے جب کہ بہت سے حضرات کا معمول ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا ہے اور بقول حضرت سعید بن مسیب اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما کے، ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا واجب ہے۔

مذکورہ بالا روایات و تشریحات کی روشنی میں ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ شروع میں کھڑے ہونے کی کراہیت امام کے انتظار کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی امام موجود نہیں ہے اور مقتدی کھڑے ہو کر انتظار کریں، یہ مکروہ ہے، کیوں کہ اس عمل میں خواہ مخواہ مشقت اور تکلف ہے جو دین کی سادگی کے خلاف ہے۔ البتہ ایک طبقہ وہ ہے جو شروع میں کھڑے ہونے کے استحباب کا قائل یا کم از کم عامل ہے اور ایک طبقہ قد قامت الصلاۃ پر کھڑے

---

(۱) ابن حجر، فتح الباری (۲/۴۵۱) عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (۸/۲۱۱) الاستذکار (۱/۳۹۱) اکمال المعلم بفوائد مسلم (۲/۵۵۷) التوضیح لشرح الجامع الصحیح (۶/۴۰۸)

ہونے کومستحب سمجھتا ہے۔ان دونوں میں سے کسی پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔البتہ قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے میں ایک اشکال یہ ہے کہ اس صورت میں عمل بالاستحباب تو ہو جائے گا جوایک گروہ کا مذہب ہےلیکن ایک دوسرے گروہ کے مطابق جوشروع میں کھڑے ہونے کوواجب کہتا ہے،اس صورت میں ترک وجوب لازم آئے گا۔اس لیے جمع وتطبیق اور رفع خلاف کا سب سے اعلی طریقہ یہی ہے کہ شروع میں کھڑا ہوا جائے۔صوفیہ کا مذہب احتیاط ہےاوراحتیاط اسی صورت میں ہے کیوں کہ اس صورت میں صرف ایک مذہب کے مطابق ترک استحباب لازم آئے گا اور دوسری صورت میں ایک مذہب کے مطابق ترک وجوب لازم آئے گااورترک استحباب ترک وجوب سے اولی واعلی ہے۔

ایک ضروری تنبیہ:

بعض لوگ اپنے موقف کوثابت کرنے کے لیے ائمہ اعلام اور کبار تابعین پر بھی نشانہ سادھنے سے نہیں چوکتے ،اپنی بات کومضبوط دلائل سے پیش کرنااوردوسرے موقف کو ضعیف قراردیناتو درست ہےلیکن خیرالقرون کےلوگوں کوقابل اعتنانہ گردانناجسارت ہے، اس سے بچناچاہیےتاکہ آنے والی نسلوں کوخارجیت کےاثرات سےمحفوظ رکھا جاسکے۔

اقامت کے مسئلے پر گفتگوکرتے ہوئے بعض علما نے ابتداے اقامت میں کھڑے ہونے کے قائلین جیسے حضرت سعید بن مسیب اورعمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما وغیرہ کے موقف کارداس طرح بھی کیا ہے کہ ’’یہ حضرات مجتہد نہیں تھے،اس لیےان کی بات قابل توجہ نہیں ہے۔‘‘ یہ سراسر غلط ہے، کیوں کہ یہ حضرات تابعین ومجتہدین ہیں، بہت سارے مسائل میں اپنی رائے رکھتے ہیں،ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ ان جلیل القدرحضرات کےعلمی مقام کواجاگر کرتے ہیں جوابتداے اقامت میں کھڑے ہونے کو واجب جانتے ہیں:

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب کا علمی مقام

آپ کا نام سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب تھا آپ جلیل القدر تابعی، محدث اور مدینہ منورہ کے مفتی اور فقہائے سبعہ سے تھے۔ آپ کے متعلق امام ذہبی لکھتے ہیں:

أحد من جمع بين العلم والعمل والزهد والشرف (۱)

آپ ان میں سے ایک تھے جنہوں نے علم وعمل اور زہد وبزرگی کو ایک ساتھ جمع کر لیا تھا۔ امام مالک بن انس آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

لم يكن أحد في زمانه اشبه منه بمن مضى من الصالحين في الزهد والفضل (۲) آپ اپنے زمانے میں سلف صالحین کی طرح زہد وورع اور شرف وبزرگی میں بے مثل تھے۔

آپ کی وفات ۱۰۶ھ مدینہ منورہ میں ہوئی۔

حضرت ابوقلابہ کا علمی مقام

آپ کا نام عبداللہ بن زید، لقب امام، شیخ الاسلام جرمی بصری ہیں، آپ بڑے تابعین میں سے ہیں۔ آپ کے متعلق حضرت حماد بن زید فرماتے ہیں: میں نے حضرت ایوب کو ابوقلابہ کے بارے میں کہتے ہوئے سنا، آپ فرمارہے تھے کہ "كَانَ أَبُو قِلَابَةَ وَاللهِ مِنَ الْفُقَهَاءِ ذَوِي الْأَلْبَابِ. (۳)

یعنی ابوقلابہ گہری فہم رکھنے والے فقیہ تھے۔ اور حلیۃ الاولیا میں ہے، حضرت مسلم بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ (۱/۸۸)

(۲) تذکرۃ الحفاظ (۱/۸۹)

(۳) سیر اعلام النبلاء (۴/۴۷۰)

لَوْ كَانَ أَبُو قِلَابَةَ مِنَ الْعَجَمِ كَانَ مُوبَذَمُوبَذَانَ ''(۱)

اگر ابوقلابہ عجمی ہوتے تو قاضی القضاہ ہوتے۔

اور اسی کتاب میں آپ کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے آپ فرماتے ہیں:

لَنْ تَزَالُوا بِخَيْرٍ يَا أَهْلَ الشَّامِ مَا دَامَ فِيكُمْ هَذَا أَوْ مِثْلُ هَذَا (۲) اے شام والو! جب تک یہ یا ان کے جیسے لوگ تمہارے درمیان رہیں گے تم لوگ بھلائی میں رہوں گے۔

آپ کی وفات ۱۰۴ / ۱۰۶ / ۱۰۷ھ میں ہوئی۔

حضرت عراک بن مالک غفاری کا مقام

آپ اجلہ تابعین سے تھے، فقیہ اور نہایت متقی تھے، آپ کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ما أعلم أحداً أكثر صلاةً من عراك بن مالك۔ (۳) میں نے عراک بن مالک سے زیادہ کسی کو نماز ادا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کی وفات تقریباً ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

حضرت محمد بن کعب قرظی کا علمی مقام

آپ تابعی، محدث اور مفسر تھے، آپ کے متعلق عون بن عبداللہ فرماتے ہیں:

ما رأيت أحدا أعلم بتأويل القرآن من القرظي. (۴)

میں نے قرظی سے زیادہ کسی کو فہم قرآن کا عالم نہیں دیکھا۔ آپ کی وفات ۱۰۸ / ۱۲۰ھ میں ہوئی۔

---

(۱) حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء (۲ / ۲۸۴)

(۲) حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء (۲ / ۲۸۴)

(۳) الوافی بالوفیات (۶ / ۳۵۶)

(۴) سیر اعلام النبلاء (۵ / ۶۸)

حضرت محمد بن مسلم ابن شہاب زہری کا علمی مقام

آپ تابعی، محدث اور فقیہ تھے، آپ کے متعلق امام مالک کا بیان ہے:

ما أدركت بالمدينة فقيها محدثا غير واحد، فقلت له: من هو؟ فقال: ابن شهاب الزهري. (۱)

میں نے مدینہ میں ایک شخص کے سوا کسی اور کو محدث اور فقیہ نہیں پایا، آپ سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا: ابن شہاب زہری۔

آپ کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی۔

حضرت سلیمان بن حبیب محاربی کا علمی مقام

آپ کا نام سلیمان بن حبیب محاربی دارانی ہے اور کنیت ابو بکر، آپ ثقہ تابعی تھے اور دمشق میں تیس سال منصب قضا پر فائز رہے۔ آپ کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا علمی مقام

آپ کا نام عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکم ہے۔ آپ کی پیدائش ۶۱ ہجری میں جب کہ وفات ۱۰۱ ہجری میں ہوئی۔ آپ خلافت بنو امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے اور سلیمان بن عبدالملک کے بعد مسند خلافت پر بیٹھے۔ آپ زہد و ورع اور عدل و انصاف کے پیکر اور پہلی صدی کے مجدد تھے۔ آپ نے اپنے دور خلافت کو منہاج نبوت پر استوار کیا، اسی وجہ سے آپ کو خلیفہ راشد بھی کہا جاتا ہے۔ (۲)

آپ کے بارے میں امام ذہبی لکھتے ہیں:

وَكَانَ مِنْ أَئِمَّةِ الاجْتِهَادِ، وَمِنَ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ - رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ (۳)

---

(۱) ابن سعد/ الطبقات الکبری (۲ / ۳۸۸)

(۲) تفصیل کے لیے دیکھئے سیرۃ ومناقب امیر المومنین للابن جوزی، ص: ۵۳ - ۵۴

(۳) سیر اعلام النبلاء (۵ / ۱۱۴)

آپ امام مجتہد اور خلیفہ راشد تھے۔

مزید امام ذہبی ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھتے ہیں:

و کان إماما فقیھا مجتھدا عارفا بالسنن کبیر الشأن ثبتا حجة حافظا قنتا لله أواھا منیبا (۱)

حضرت عمر بن عبد العزیز امام، فقیہ مجتہد، سنت نبویہ کے عارف، بڑی شان کے مالک، ثقہ، حجت، حافظ، اللہ کے مطیع، گریہ کناں اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

امام ابن کثیر ''البدایۃ والنہایۃ'' میں لکھتے ہیں:

فَقَالَ جَمَاعَةٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْهُمْ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فِيمَا ذَكَرَهُ ابْنُ الْجَوْزِيّ وَغَيْرُهُ: إِنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ كَانَ عَلَى رَأْسِ الْمِائَةِ الْأُولَى، وَإِنْ كَانَ هُوَ أَوْلَى مَنْ دَخَلَ فِي ذَلِكَ وَأَحَقَّ، لِإِمَامَتِهِ وَعُمُومِ وِلَايَتِهِ، وقیامه واجتهاده فِي تَنْفِيذِ الْحَقِّ (۲)

حضرت امام احمد بن حنبل سمیت اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے جس کو ابن جوزی کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز پہلی صدی کے مجدد تھے، کیوں کہ آپ ہی اپنی انوکھی امامت، حکومت، نظامت اور نفاذ حق میں اجتہادی شان رکھنے کی وجہ سے اس کے زیادہ حق دار تھے۔

ابن کثیر ''البدایۃ والنہایۃ'' ہی میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: **قال الإمام أحمد بن حنبل لا أدري قول أحد من التابعين حجة إلا قول عمر بن عبد العزيز (۳)**

امام احمد بن حنبل نے فرمایا: تابعین میں سے سوائے عمر بن عبد العزیز کے کسی کو میں نہیں جانتا جس کا قول دوسروں کے لیے حجت ہو۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ (۱/۹۰)

(۲) البدایۃ والنہایۃ (۹/۲۰۷)

(۳) البدایۃ والنہایۃ (۹/۱۹۲)

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا قول دوسرے کے لیے حجت ہوا کرتا تھا۔

اور علامہ عبد القادر محی الدین قرشی حنفی (۷۷۵ھ) فرماتے ہیں:

فَائِدَة: يَقُولُونَ أَصْحَابنَا فِي كتبهمْ فِي مَسَائِل الْخلاف: (وَهُوَ قَول عمر الصَّغِير) يُرِيدُونَ بِهِ عمر بن عبد العزيز الإِمَام الْخَلِيفَة الْمَشْهُور۔(۱)

اختلافی مسئلے میں ہمارے اصحاب حنفیہ کہتے ہیں ''یہ عمرِ صغیر کا قول ہے'' اور اس سے مراد عمر بن عبد العزیز ہوتے ہیں جو مشہور امام اور خلیفہ ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احناف کے درمیان جب کسی مسئلے میں اختلاف ہوتا تو بطور استدلال حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کا قول پیش کیا جاتا۔

اب اگر کوئی ان کے قول کو یہ کہہ کر رد کر دے کہ وہ مجتہد نہیں تھے تو اس کا یہ رد کتنا سطحی ہوگا، اس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔

حضرت سعید بن مسیب کا علمی مقام:

آپ کا نام سعید بن مسیب بن حزن بن ابی وھب مخزومی ہے، آپ کا لقب عالم اہل المدینۃ اور سید التابعین ہے، آپ کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت ۱۵ ہجری میں ہوئی اور وفات ۹۴ ہجری میں، آپ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے، آپ اپنے علم اور فقاہت کی وجہ سے صحابہ کی موجودگی ہی میں فتوی دینے لگے تھے۔(۲)

ابن شہاب زہری آپ کے متعلق فرماتے ہیں:

كنت أطلب العلم من ثلاثة: سعيد بن المسيب، كان أفقهَ الناس(۳)

---

(۱) الجواهر المضية فی طبقات الحنفية (۴/ ۵۵۲)

(۲) صور من حياة التابعين (ص: ۱۹۷)

(۳) اعلام الموقعين عن رب العالمين لابن القيم (۲/ ۴۰)

میں تین لوگوں سے علم حاصل کرتا تھا، ان میں سے ایک سعید بن مسیب ہیں جو سب سے بڑے فقیہ تھے۔

ڈاکٹر وھبہ زہیلی نے اپنی کتاب ''سعید بن مسیب، سید التابعین'' میں آپ کے فقہ کے متعلق ایک باب باندھا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

اشتهر سعيد بن مسيب بالفقه و الفتوى، لانه كان فقيه النفس، و اسع العلم، خصب المعرفة، و اعلم الناس بالقضا، حتى قيل له ''فقيه الفقهاء'' و كان اعلم الناس بماتقدمه من الآثار و افقههم فى رأيه (۱)

سعید بن مسیب فقہ اور فتاوی میں مشہور تھے، کیوں کہ آپ فقیہ النفس، علم میں وسیع النظر اور مسئلہ قضا کو لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے، اسی لیے آپ کا لقب ''فقیہ الفقہا'' تھا، آپ صحابہ کے آثار کے سب سے بڑے عالم تھے اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔

ڈاکٹر وھبہ زہیلی اسی کتاب میں آگے لکھتے ہیں:

قال ابن قتيبة: كان سعيد افقه اهل الحجاز (۲)

ابن قتیبہ فرماتے ہیں: سعید بن مسیب حجاز کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔

کچھ صفحے بعد ڈاکٹر زہیلی حضرت سعید بن مسیب کے فقہی منہج کے بارے میں لکھتے ہیں:

كان سعيد بن المسيب فى الاجتهاد الفقهى هو نفس منهج الصحابة، بالاعتماد على مصادر الفقه الإساسية الأربعة و هى الكتاب و السنة و الإجماع و القياس، إذا لم يجد حكما للحادثة فى القرآن و السنة و الإجماع نظر و تخير من

---

(۱) سعید بن مسیب، سید التابعین (ص: ۱۲۵-۱۲۶)

(۲) سعید بن مسیب، سید التابعین (ص: ۱۲۶)

أقوال الصحابة واتبع عن دليل و فكر لا عن تقليد (۱)

سعید بن مسیب فقہی اجتہاد میں بعینہ صحابہ کے منہج پر تھے، فقہ کے جو چار بنیادی ماخذ کتاب وسنت اور اجماع وقیاس ہیں، ان ہی پر اعتماد کرتے تھے، جب درپیش مسائل میں کتاب وسنت اور اجماع سے دلیل نہ پاتے تو غور وفکر کے ذریعہ اقوال صحابہ میں سے کسی ایک قول کو اختیار فرماتے اور اس معاملے میں دلیل کی پیروی کرتے، کسی کی تقلید نہیں کرتے۔

مذکورہ حوالوں کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ خود مجتہد تھے اور کثیر صحابہ کی موجودگی میں آپ کی طرف لوگ مسائل میں رجوع فرماتے تھے، اس کے باوجود کوئی ان کی بات یہ کہہ کر رد کردے کہ وہ مجتہد نہیں تھے، تو ایسے شخص کے بھولے پن پر حیرت ہوتی ہے۔

(۱) سعید بن مسیب، سید التابعین (ص: ۱۲۸)

مسئلہ اقامت میں مذاہب اربعہ کا موقف

اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں حضور رسالت مآب، صحابہ اور تابعین کے معمولات کے حوالے سے مختلف روایات اور ان میں تطبیق وترجیح کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو ائمہ مجتہدین اور مذاہب اربعہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

امام مالک کا مذہب:

''موطا'' میں ہے کہ امام مالک سے اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

وَأَمَّا قِيَامُ النَّاسِ، حِينَ تُقَامُ الصَّلَاةُ، فَإِنِّي لَمْ أَسْمَعْ فِي ذَلِكَ بِحَدٍّ يُقَامُ لَهُ، إِلَّا أَنِّي أَرَى ذَلِكَ عَلَى قَدْرِ طَاقَةِ النَّاسِ، فَإِنَّ مِنْهُمُ الثَّقِيلَ وَالْخَفِيفَ، وَلَا يَسْتَطِيعُونَ أَنْ يَكُونُوا كَرَجُلٍ وَاحِدٍ (۱)

اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی حد کیا ہے؟ اس سلسلے میں میں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جس کی روشنی میں اس کی کوئی متعین حد مقرر کی جائے۔ البتہ میرے نزدیک یہ مسئلہ لوگوں کی استطاعت پر موقوف ہے، کیوں کہ بعض لوگ بھاری جسم کے ہوتے ہیں اور بعض ہلکے جسم کے ہوتے ہیں، سب لوگ ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے اس لیے سب ایک ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے۔

امام شافعی کا مذہب:

امام محی الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

---

(۱) موطا مالک، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۷۰)

مَذْهَب الشَّافِعِيّ - رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى - وَطَائِفَة : أَنَّهُ يُسْتَحَبّ أَلَّا يَقُوم أَحَد حَتَّى يَفْرُغ الْمُؤَذِّن مِنْ الْإِقَامَة (۱)

امام شافعی اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اقامت سے فراغت کے بعد کھڑا ہونا مستحب ہے۔

اس سلسلے میں امام شافعی کا دوسرا قول بھی ہے جس کو امام ابن عبدالبر نے ''تمہید'' میں بیان کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

وَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَأَصْحَابُهُ وَدَاوُدُ الْبِدَارُ فِي الْقِيَامِ إِلَى الصَّلَاةِ أَوْلَى فِي أَوَّلِ أَخْذِ الْمُؤَذِّنِ فِي الْإِقَامَةِ لِأَنَّهُ بِدَارٌ إِلَى فِعْلِ بِرٍّ وَلَيْسَ فِي ذَلِكَ شَيْءٌ مَحْدُودٌ عِنْدَهُمْ (۲)

امام شافعی، ان کے اصحاب اور امام داؤد نے فرمایا: مکبر کے اقامت شروع کرتے ہی فورا نماز کے لیے کھڑا ہوجانا اولی ہے، کیوں کہ یہ نیک عمل کی طرف جلدی کرنا ہے اور نیکی میں جلدی کرنے کے سلسلے میں ان کے نزدیک کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل کا مذہب:

مقتدی بوقت اقامت کب کھڑے ہوں؟ اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل سے بھی دو قول منقول ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ مقتدی قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہوں۔ (۳)

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر امام مسجد میں موجود ہو تو اقامت کے ابتدا ہی میں کھڑے ہوں۔ (۴)

---

(۱) شرح النووی علی مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ (۵ / ۱۰۳)

(۲) التمہید، حرف میم، تابع لمحمد بن شہاب زہری (۹ / ۱۹۰)

(۳) شرح النووی علی مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ (۵ / ۱۰۳)

(۴) الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف، کتاب الامامۃ، ذکر وقت قیام المامومین لی الصلاۃ (۴ / ۱۶۷)

المختصر! ائمۂ ثلاثہ اور جمہور مجتہدین کے یہاں اول اقامت میں کھڑا ہونا مستحب ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے۔یہی امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل کا مذہب ہے۔جیسا کہ مشہور حنفی شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

ذهب مَالک وَ جُمْهُور الْعلمَاء إِلَى أَنه لَيْس لقيامهم حد، وَلكِن اسْتحبَّ عامتهم الْقيام إِذا أَخذ الْمُؤَذّن فِي الْإِقَامَة، (۱)

امام مالک اور جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ کھڑے ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، پھر ان میں سے اکثر علما کا مذہب یہ ہے کہ اقامت شروع ہوتے ہی کھڑا ہونا مستحب ہے۔

البتہ اس سلسلے میں امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اقامت ختم ہونے کے بعد کھڑا ہونا مستحب ہےاوراسی طرح امام احمد کا بھی ایک قول ہے کہ قدقامت الصلوۃ پر کھڑا ہونا مستحب ہے۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب:

فقہائے احناف کے نزدیک اقامت کے وقت مقتدیوں کے کھڑے ہونے کے سلسلے میں امام کے مسجد میں ہونے کے وقت الگ حکم ہےاور نہ ہونے کی صورت میں اس کے مسجد میں داخل ہونے کی کیفیت کے لحاظ سے الگ الگ طریقہ مذکور ہےجس کی قدرے تفصیل آنے والے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

---

(۱) عمدۃ القاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب متی یقوم الناس إذا رأوا الامام عند الاقامۃ (۸/ ۲۱۱)

مسئلہ اقامت میں فقہاے احناف کی تفصیل

اور بعض اختلافات میں تطبیق وترجیح کی ممکنہ صورتیں

فقہ حنفی کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر تفصیل وتوضیح اور روایت ودرایت کا کمال امتزاج پایا جاتا ہے، اسی طرح شریعت کی حکمت بالغہ، مقاصد شریعت، عرف وعادات اور احوال زمانہ کی سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کے اندر عقل ودرایت کا بھرپور استعمال ہوا ہے، اسی کا ایک مظہر ہمیں مسئلہ اقامت میں فقہ حنفی کی تفصیلات میں بھی نظر آتا ہے۔

اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی فقہاے احناف نے بطور خاص تین صورتیں بیان کی ہیں؛

پہلی صورت یہ ہے کہ امام صفوں کی طرف سے مسجد میں داخل ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ جس جس صف سے امام گزرتا جائے، اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ امام اقامت کے وقت محراب کی جانب سے مسجد میں داخل ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہوجائیں، جیسا کہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

إذَا كان الْإِمَامُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ فَإِنْ دخل الْمَسْجِدَ من قِبَلِ الصُّفُوفِ فَكُلَّمَا جَاوَزَ صَفًّا قام ذلک الصَّفُّ وَإِلَيْهِ مَالَ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ الْحَلْوَانِيُّ وَالسَّرَخْسِيُّ وَشَيْخُ الْإِسْلَامِ خُوَاهَرْ زَادَهْ وَإِنْ كان الْإِمَامُ دخل الْمَسْجِدَ من

قُدَّامِهِمْ يَقُومُونَ كمارَأَى الْإِمَامَ(۱)

اگرامام مسجد کے باہر ہواور مسجد میں صف کی جانب سے داخل ہوتوامام جس جس صف سے گزرتا جائے ،اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں،اسی کی طرف شمس الائمہ حلوانی،امام سرخسی اور شیخ الاسلام خواہرزادہ گئے ہیں اوراگرامام مسجد میں آگے سے داخل ہو تومقتدی امام کودیکھتے ہی کھڑے ہوجائیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ امام اقامت کے وقت مسجد میں موجود ہو،تو اس کاحکم یہ ہے کہ امام اورمقتدی **حی علی الفلاح** پرکھڑے ہوں،جیسا کہ امام محمد رحمہ اللہ ''موطا'' میں فرماتے ہیں:

ينبغي للقوم إذا قال المؤذن حي على الفلاح أن يقوموا إلى الصلاة... وهو قول أبي حنيفة-رحمه الله-(۲)

بہتر ہے کہ جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے اس وقت مقتدی کھڑے ہوں،یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

درمختارشرح تنویرالابصار میں ہے:

(والقيام) لإمام ومؤتم (حين قيل حي على الفلاح) خلافا لزفر، فعنده عند حي على الصلاة (إن كان الإمام بقرب المحراب) (۳)

یعنی آداب نماز میں سے ہے کہ امام اورمقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے اورامام زفر کے نزدیک امام اورمقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر

---

(۱)الفتاوی الہندیۃ(۱/ ۵۷)

(۲)الموطا-روایۃ محمد بن الحسن(۱/ ۱۷۲)

(۳)الدرالمختارشرح تنویرالابصار(ص:٦٦)

حی علی الصلاۃ پر پہنچے، اگر امام محراب میں ہو۔

علامہ ابوالاخلاص حسن بن عمار بن علی وفائی شرنبلالی (۱۰۶۹ھ) فرماتے ہیں:

من آدابها... والقيام حين قيل حي على الفلاح وشروع الإمام مذ قيل قد قامت الصلاة(۱)

آداب نماز سے ہے کہ مقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر **حی علی الفلاح** پر پہنچے، اور امام نماز اس وقت شروع کرے جب مکبر **قد قامت الصلاۃ** کہے۔

خلاصہ یہ کہ فقہاے احناف کے نزدیک **حی علی الفلاح** یا **حی علی الصلاۃ** پر کھڑا ہونا لیکن امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک **قدقامت الصلاۃ** کہنے کے وقت اور امام ابو یوسف کے نزدیک اقامت ختم ہونے کے بعد، نماز شروع کر دینا مستحب ہے۔

امام طحطاوی کا موقف:

فقہاے احناف میں سے ایک نامور فقیہ امام طحطاوی (متوفی: ۱۲۳۱ھ) ابتدائے اقامت ہی میں قیام کے قائل ہیں اور درالمختار پر دو حواشی جو مقبول ہوئے ان میں ایک علامہ ابن عابدین شامی کا ہے اور دوسرا آپ کا ہے۔ آپ ''درمختار'' کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

(والقيام لإمام و مؤتم الخ) مسارعة لامتثال أمره و الظاهر أنه احترازا عن التأخير لا التقديم حتى لو قام أول الإقامة لا بأس (۲)

(امام اور مقتدی کا کھڑا ہونا) یعنی مکبر کی آواز پر لبیک کہنا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا یہ تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا، لہٰذا کوئی اگر ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو اس

---

(۱) نورالایضاح (ص: ۴۷)

(۲) طحطاوی علی الدرالمختار (۱/ ۲۱۵)

میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

کیا شروع اقامت میں کھڑا ہونا احناف کے نزدیک مکروہ ہے؟

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں فقہ حنفی میں تفصیل ہے۔ امام آگے سے آئے تو اسے دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جائیں اور یہی حضور رسالت میں عین سنت صحابہ ہے۔ اگر پیچھے سے آئے تو جس صف سے گزرے اور جو لوگ اسے دیکھیں سب کھڑے ہو جائیں۔ ہاں اگر امام پیشگی طور پر مسجد میں موجود ہو تو مقتدیوں کو حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہیے۔ شارح درمختار امام طحطاوی نے اس میں مزید یہ نکتہ آفرینی فرمائی کہ یہ استحباب کی آخری حد ہے اس لیے اس سے پہلے بھی کوئی کھڑا ہو تو استحباب باقی رہے گا، البتہ اگر حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح تک بھی کھڑا نہیں ہو سکا تو ایسا شخص استحباب کے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ امام طحطاوی کے برخلاف بعض فقہائے متاخرین نے حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کے استحباب کے ساتھ ایک نئے مسئلے کا اضافہ کیا کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا نہ صرف یہ کہ خلاف استحباب ہے بلکہ مکروہ ہے۔ یہ بعض متاخرین کی غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ غلط فہمی نقل در نقل فقہائے متاخرین کے یہاں چلی آ رہی ہے، ہم اس سلسلے میں پہلے فقہائے متاخرین کا موقف اور ان کے دلائل ذکر کریں گے، پھر استنباط مسائل میں جو تسامح ہوا ہے اس کی وضاحت کریں گے۔

متاخرین فقہا نے اقامت شروع ہونے کے وقت کھڑے ہونے کو مکروہ لکھا ہے۔

چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے: إِذَا دخل الرَّجُلُ عِنْدَ الْإِقَامَةِ يُكْرَهُ له الِانْتِظَارُ قَائِمًا وَلٰكِنْ يَقْعُدُ ثُمَّ يَقُومُ إِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ قَوْلَهُ حَيَّ علی الْفَلَاحِ كَذَا في الْمُضْمَرَاتِ (۱)

جب نمازی اقامت کے وقت مسجد میں آئے تو اس کے لیے کھڑے ہو کر انتظار کرنا

---

(۱) الفتاوی الہندیۃ، کتاب الصلاۃ، الفصل الثانی فی کلمات الاذان والاقامۃ وکیفیتہما (۱ / ۵۷)

مکروہ ہے، وہ بیٹھ جائے اور اس وقت کھڑا ہو جب مکبر **حی علی الفلاح** پر پہنچے، ایسا ہی مضمرات میں لکھا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ ''ردالمحتار'' میں تحریر فرماتے ہیں:

وَيُكْرَهُ لَهُ الِانْتِظَارُ قَائِمًا ، وَلَكِنْ يَقْعُدُ ثُمَّ يَقُومُ إذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ انْتَهَى هِنْدِيَّةٌ عَنْ الْمُضْمَرَاتِ (۱)

یعنی نمازی کے لیے کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے، وہ بیٹھ جائے، پھر اس وقت کھڑا ہو جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے، ہندیہ کی عبارت ختم ہوئی، یہ مسئلہ ''مضمرات'' سے ماخوذ ہے۔

ان کے علاوہ دوسرے فقہائے متاخرین نے بھی ''مضمرات'' کے حوالے سے ابتدائے اقامت کے وقت کھڑے ہونے کو مکروہ لکھا ہے، اور صاحب مضمرات یوسف بن عمر صوفی کی وفات ۸۳۲ھ میں ہوئی ہے، اس سے واضح ہوا کہ کراہت کا یہ قول نویں صدی ہجری سے متعلق ہے، اس سے پہلے شروع اقامت میں کھڑے ہونے کے سلسلے میں کراہت کا قول نہیں ملتا، لیکن خود صاحب مضمرات (۲) کو اس مسئلے کے استنباط میں تسامح ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب مضمرات نے اس مسئلے کو جس دلیل سے مستنبط کیا ہے، اس دلیل سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

فإذا دخل الرجل عند الإقامة يكره له الانتظار والقيام ولكن يقعد ثم يقوم إذا بلغ المؤذن قوله حي على الفلاح هكذا جاء الأثر عن علي (۳)

---

(۱) ردالمحتار مع الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۳/۲۴۰)

(۲) یوسف بن عمر بن یوسف صوفی کادوری (متوفی: ۸۳۲ھ) آپ شریعت وطریقت کے جامع اور صاحب فتاوی صوفیہ کے استاذ تھے، آپ کی یہ کتاب فقہ حنفی میں فروعی مسائل پر ایک بہترین کتاب ہے جو مختصر القدوری کی شرح ہے۔ (الفوائد البہیہ للامام اللکنوی)

(۳) جامع المضمرات والمشکلات: ص، ۶۸، مخطوطہ

جب نمازی اقامت کے وقت مسجد میں داخل ہو تو اس کے لیے کھڑا ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے، وہ بیٹھ جائے، پھر اس وقت کھڑا ہو جب مکبر حی علی الصلاۃ پر پہنچے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ''اثر'' میں ہے۔

اس اثر کو امام ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں ذکر کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

خَرَجَ عَلِيٌّ، وَقَدْ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَهُمْ قِيَامٌ يَنْتَظِرُونَهُ، فَقَالَ: مَا لِي أَرَاكُمْ سَامِدِينَ؟ (۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کے لیے نکلے، اس وقت اقامت ہو چکی تھی اور لوگ کھڑے آپ کا انتظار کر رہے تھے، آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: میں تمہیں حیران و پریشان کھڑے کیوں دیکھ رہا ہوں؟

آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں کھڑے ہو کر میرا انتظار نہیں کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ امام کی عدم موجودگی میں امام کا کھڑے ہو کر انتظار کرنا مشقت میں پڑنا ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ: **لَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي** (۲) یعنی اس وقت تک مت کھڑے ہو جب تک مجھے نہ دیکھ لو۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ امام اگر موجود نہ ہو تو امام کے انتظار میں کھڑا نہ ہونا چاہیے، اسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب کو منع فرمایا تھا کہ اگر میں موجود نہ رہوں تو میرے انتظار میں کھڑے نہ رہا کرو۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے معلوم ہوا کہ کراہت کا قول اس صورت میں ہے، جب امام مسجد میں نہ ہو، ورنہ کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ جامع فقہ حنفی امام محمد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''المبسوط'' میں لکھا ہے، آپ فرماتے ہیں:

وأما إذا لم يكن الإمام معهم في المسجد فإنني أكره لهم أن يقوموا في

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الصلوات، باب القوم یقومون اذا اقیمت الصلاۃ قبل ان یجیء الامام (ح: ۴۰۹۴)

(۲) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب: متی یقوم الناس، اذا رأوا الامام عند الاقامۃ (ح: ۶۳۷)

الصف و الإمام غائب عنهم (۱) جب امام مسجد میں موجود نہ ہو بلکہ مسجد سے باہر ہو تو میں صف میں کھڑے ہونے کو مکروہ سمجھتا ہوں۔

چنانچہ شارح فقہ حنفی امام الائمہ علامہ شمس الدین محمد بن احمد بن سہل سرخسی (۴۸۳ھ) نے اس مسئلہ کی دلیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ''اثر'' کو ذکر کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

إِذَا لَمْ يَكُنْ الْإِمَامُ مَعَهُمْ فِي الْمَسْجِدِ يُكْرَهُ لَهُمْ أَنْ يَقُومُوا فِي الصَّفِّ حَتَّى يَدْخُلَ الْإِمَامُ لِقَوْلِهِ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ -: لَا تَقُومُوا فِي الصَّفِّ حَتَّى تَرَوْنِي خَرَجْتُ، وَإِنَّ عَلِيًّا - رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ - دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَرَأَى النَّاسَ قِيَامًا يَنْتَظِرُونَهُ فَقَالَ مَالِي أَرَاكُمْ سَامِدِينَ أَيْ وَاقِفِينَ مُتَحَيِّرِينَ (۲)

جب امام مقتدیوں کے ساتھ مسجد میں موجود نہ ہو، تو ان کے لیے صف میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، جب تک کہ امام نہ آجائے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: اس وقت تک نہ کھڑے ہو جب تک مجھے نہ دیکھ لو کہ میں نماز کے لیے نکل چکا ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا: کیا بات ہے کہ میں تمہیں حیران و پریشان کھڑا دیکھ رہا ہوں؟

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ کھڑے ہونے کی ممانعت صرف اس صورت میں ہے جب امام مسجد میں موجود نہ ہو، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ''اثر'' سے عندالاقامۃ کھڑے ہونے کو مکروہ ثابت کرنا صاحب مضمرات کا تسامح ہے اور وہ بھی ایسا تسامح جو جامع فقہ حنفی امام محمد اور شارح فقہ حنفی امام سرخسی کی تشریح کے خلاف ہے، امام سرخسی کا مذکورہ حوالہ ان کی شہرۂ آفاق کتاب المبسوط سے ماخوذ ہے اور اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مبسوط فقہ حنفی کی کتب

---

(۱) المبسوط، کتاب الصلاۃ، باب افتتاح الصلاۃ (۱/۱۹)

(۲) المبسوط، کتاب الصلاۃ، باب افتتاح الصلاۃ (۱/۳۵)

ظاہرالروایہ (مبسوط، زیادات، سیر کبیر، سیر صغیر، جامع کبیر، جامع صغیر) کی جامع کتاب ہے، کتب ظاہرالروایہ کی اس جامع کتاب کے بالمقابل نویں صدی ہجری کے ایک حنفی صوفی فقیہ کی تشریح کو پیش کرنا اصولی اعتبار سے کیا ہے؟ یہ بتانے کی حاجت نہیں، جب کہ مبسوط کے بالمقابل اگر امام محمد کی کتب نادر الروایہ کا کوئی حوالہ بھی آتا ہے تو حنفی اصول فتوی کے مطابق اسے بھی رد کر دیا جاتا ہے۔ افسوس کہ صاحب مضمرات کی متابعت میں یہ تسامح متاخرین فقہا میں بھی در آیا اور آج بعض حضرات اسے ہی اصل فقہ حنفی سمجھتے ہیں۔

فقہا سے بعض مسائل میں اس طرح کا تسامح در تسامح واقع ہونا کوئی مستعبد بات بھی نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی ''عقود رسم المفتی'' میں لکھتے ہیں:

و قد يتفق نقل قول في نحو عشرين كتابا من كتب المتأخرين؛ و يكون القول خطا، أخطأ به أول واضع له، فياتي من بعده، وينقله عنه، وهكذا ينقل بعضهم عن بعض، كما وقع ذلك في بعض مسائل ۔(۱)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات متاخرین فقہا کی بیسیوں کتابوں میں نقل ہوتی ہے، حالانکہ وہ بات غلط ہوتی ہے، جو پہلے والے سے ہوئی ہوتی ہے لیکن بعد والے اس کو نقل در نقل کرتے رہتے ہیں جیسا کہ بعض مسائل میں ایسا ہوا ہے۔

اقامت امام کا حق ہے:

یہاں ایک بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اقامت کہنا مکبر کا حق ہے وہ جب چاہے اقامت کہہ سکتا ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اقامت کا حق امام کا ہے، جب امام کی اجازت ہوگی خواہ قولاً اجازت ہو یا اشارۃً اس وقت مکبر اقامت کہہ سکتا ہے، جس طرح مؤذن کو اذان دینے کا حق حاصل ہے

(۱) شرح عقود رسم المفتی، ص: ۶۲، مکتبۃ زکریا دیوبند

کہ جب نماز کا وقت ہو جائے وہ اذان دے سکتا ہے، اُس طرح مکبر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جب چاہے اقامت کہہ دے تا آں کہ امام سے اقامت کہنے کی اجازت نہ مل جائے، جیسا کہ ابن حجر نے ''بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام'' میں اور ابن عدی نے ''**الکامل فی الضعفاء**'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"**الْمُؤَذِّنُ أَمْلَکُ بِالْأَذَانِ، وَ الْإِمَامُ أَمْلَکُ بِالْإِقَامَةِ**(۱)

یعنی مؤذن اذان کے اور امام اقامت کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو شریک نے اعمش سے روایت کیا ہے اور وہ ابو صالح سے روایت کرتے ہیں اور ابو صالح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کرتے ہیں لیکن یہ حدیث محفوظ نہیں ہے۔(۲)

راجح یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً محفوظ ہے چنانچہ ترمذی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبد الرزاق اور کتاب الصلاۃ میں یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً ہی مروی ہے۔(۳)

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اقامت کا حق امام کو ہے کہ وہ جب چاہے نماز کے لیے آئے اور جب چاہے نماز قائم کرے، اس کے لیے کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسجد میں آکر پہلے سے بیٹھ جائے، پھر تکبیر کہنے کا حکم دے اور نہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اگر پہلے سے مسجد میں بیٹھا ہو تو تکبیر کہنے کا حکم دینے کے بعد

---

(۱) بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام (ص: ۱۱۲) الکامل فی الضعفاء (۴/ ۱۲)

(۲) بیہقی/ السنن الکبری، کتاب الصلاۃ، باب لا یقیم المؤذن حتی یخرج الامام ح: ۲۲۷۹)

(۳) سنن الترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ما جاء ان الامام احق بالاقامۃ ح: ۲۰۲) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلوات، باب الامام ینتظر بالصلاۃ، ح: ۴۱۷۱) مصنف عبد الرزاق، کتاب الصلاۃ، باب المؤذن املک بالاذان ح: ۱۸۳۶) کتاب الصلاۃ لابی نعیم، باب المؤذن املک بالاذان ح: ۲۸۸)

حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح تک بیٹھے انتظار کرتا رہے، بلکہ مقتدیوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ امام کی پیروی کریں کہ اگر امام بیٹھا ہوتو وہ بھی بیٹھیں اگر امام کھڑا ہوتو وہ بھی کھڑے ہوجائیں، بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تو کسی طرح کی کوئی پابندی تھی ہی نہیں، یہی وجہ ہے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آدھی رات تک نماز کو مؤخر فرما دیا اور صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتظار فرماتے رہے، صحیح بخاری کی حدیث ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: أَخَّرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلاَةَ ذَاتَ لَيْلَةٍ إِلَى شَطْرِ اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا، فَلَمَّا صَلَّى أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: إِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا وَرَقَدُوا، وَإِنَّكُمْ لَنْ تَزَالُوا فِي صَلاَةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلاَةَ (۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ آدھی رات تک نماز مؤخر کردی، پھر ہمارے پاس تشریف لائے اور جب نماز سے فارغ ہوگئے تو ہماری جانب متوجہ ہوکر ارشاد فرمایا: لوگ نماز ادا کر کے سو گئے اور جب تک تم لوگ انتظار کر رہے تھے نماز ہی میں تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف نہ لے آتے اس وقت تک اقامت نہیں کہی جاتی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے لیے کوئی پابندی نہیں تھی، آپ جب چاہتے نماز کے لیے باہر تشریف لاتے۔

یہیں سے امام کا حکم بھی مستنبط ہوا کہ امام کی اجازت کے بغیر اقامت نہیں کہی جاسکتی، اور نہ امام پر نماز کے عینِ وقت پر آنا ہی لازم ہے۔ ہاں امام کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ جماعت کا وقت ہوتے ہی نماز کے لیے آجائے تاکہ مقتدیوں کو مشقت کا سامنا نہ ہو، لیکن آج ہمارے معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ امام اگر ایک دو منٹ بھی لیٹ کردے تو عوام

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب یستقبل الامام الناس اذا سلم، ح:۸۴۷)

بھڑک اٹھتے ہیں اور کبھی کبھی امام کے ساتھ بدسلوکی بھی کر جاتے ہیں، یہ نہایت افسوس ناک پہلو ہے، جب کہ مقتدیوں کو چاہیے کہ امام کا انتظار کریں کیوں کہ جب تک وہ امام کا انتظار کرتے رہیں گے ان کو ثواب ملتا رہے گا۔

فتاوی رضویہ میں ہے:

''وقت کراہت تک انتظار امام میں ہرگز تاخیر نہ کریں، ہاں وقت مستحب تک انتظار باعث زیادت اجر وتحصیل افضلیت ہے، پھر اگر وقت طویل ہے اور آخر وقت مستحب تک تاخیر حاضرین پر شاق نہ ہوگی کہ سب اس پر راضی ہیں تو جہاں تک تاخیر ہو اتنا ہی ثواب ہے کہ سارا وقت ان کا نماز ہی میں لکھا جائے گا الخ۔''(۱)

بعض جگہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عین وقت جماعت امام باہر سے آ کر پہلے مصلی پر بیٹھ جاتا ہے پھر اس کے بعد تکبیر ہوتی ہے اور حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح پر امام ومقتدی سب کھڑے ہوتے ہیں، یہ احایث کریمہ بلکہ فقہا کے بھی خلاف ہے، ایسا طریقہ نہ حدیث سے ثابت ہے اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی ایسا کیا ہے اور نہ ہی کسی فقیہ سے اس طرح کا قول منقول ہے۔ فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان نے بھی اس کو اپنے فتاوی میں لکھا ہے:

آپ سے سوال ہوا کہ

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد کے حجرہ میں امام ہو اور تکبیر مکبر شروع کردے اب امام حجرہ سے روانہ ہو، ختم تکبیر سے پہلے حی علی الفلاح کے وقت یا بعد ختم تکبیر مصلے پر پہنچ جاوے، اس میں کوئی قباحت تو نہیں ہے بصورت احیاناً یا بصورت دواماً، ہر دو صورت کا کیا حکم ہے؟

اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

---

(۱) فتاوی رضویہ (۸/ ۲۰۵)

اس صورت میں کوئی حرج نہیں، نہ امام مکبر کا پابند ہوسکتا ہے بلکہ مکبر کو امام کی پابندی چاہیے، حدیث میں ہے **المؤذن أملک بالأذان، والإمام أملک بالإقامة** (اذان کا اختیار مؤذن کو ہے اور اقامت کا اختیار امام کو) اور اگر وہ تکبیر ہوتے میں چلا تو اسے بیٹھنے کی بھی حاجت نہیں، مصلے پر جائے اور **حي علی الفلاح** یا ختم تکبیر پر تکبیر تحریمہ کہے، یونہی بعد خطبہ اسے اختیار ہے کہیں منقول نہیں کہ خطبہ فرما کر تکبیر ہونے تک جلوس فرماتے، یہ حکم قوم کے لیے، واللہ اعلم (۱)

فاضل بریلوی کے اس فتوی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ خطبہ جمعہ کے بعد امام کے لیے بیٹھنا ثابت نہیں بلکہ امام منبر سے اترنے کے بعد **حي علی الصلاۃ** یا **حي علی الفلاح** کا انتظار کیے بغیر شروع اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے، لہٰذا جب جمعہ کی نماز کے لیے بیٹھنا ثابت نہیں ہے حالانکہ یہی ایک موقع ہے جہاں امام بیٹھ سکتا تھا تو دیگر نماز کے لیے بیٹھنا کہاں سے ثابت ہوگا اور دیگر نمازوں میں **حي علی الصلاۃ** یا **حي علی الفلاح** کا انتظار کرنے میں کون سی حکمت ہے؟

واضح رہے کہ جب خطبہ جمعہ کے بعد امام کا بیٹھنا ثابت نہیں بلکہ اسے سیدھے مصلے پر کھڑا ہو جانا ہے تو اس صورت میں کم از کم جمعہ کی حد تک تو عام مقتدیوں کو اول اقامت میں کھڑا ہونا ہی چاہیے، اس لیے کہ یہ کسی کا مذہب نہیں کہ امام کھڑا ہو اور مقتدی بیٹھے رہیں، اس تناظر میں اگر کوئی سنت کو رائج کرنے کی بات کرتا ہے، بطور خاص ہندوستان کی تقریبا تمام سنی بریلوی مسجدوں میں رائج ہو گیا ہے، تو اسے یہ حق ملنا چاہیے اور سنی بریلوی علما کو اس احیائے سنت کے مشن کا حصہ بننا چاہیے جو صرف خارج مسجد اذان ثانی کرانے کو احیائے سنت سمجھتے ہیں، تفصیل پیچھے گزر چکی۔

---

(۱) فتاوی رضویہ (۵/ ۴۱۹)

خلاصہ یہ ہے کہ کبھی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے **حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح** تک بیٹھے رہنے کا ثبوت نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی حکمت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا امام جب چاہے کھڑا ہو اور مقتدی امام کی پیروی کریں۔ یہ بلا کراہت اور بلا نکیر جائز ہے، البتہ فقہ حنفی کے مطابق مستحب یہ ہے کہ امام و مقتدی سب **حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح** پر کھڑے ہوں، اور امام طحطاوی کی تشریح کے مطابق شروع اقامت میں بھی کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں روز روشن کی طرح یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ شروع اقامت میں بھی امام اور مقتدیوں کا ایک ساتھ کھڑا ہونا احادیث اور تشریحات فقہا کے خلاف نہیں ہے۔

مخالفت یا عزیمت؟

بعض لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والوں پر احناف کی مخالفت کا حکم لگاتے ہیں، جب کہ معاملہ ایسا نہیں ہے، یہ لوگ احناف کی مخالفت نہیں کرتے، زیادہ سے زیادہ پہلے سے امام اگر موجود رہے اور سب اگر شروع میں کھڑے ہو جاتے ہیں تو بظاہر فقہ حنفی کی رو سے استحباب کا ترک ہو رہا ہے، بلکہ حنفی فقیہ امام طحطاوی نے ائمہ احناف کے اقوال کی ایسی شرح فرمائی کہ اس کے بعد ترک استحباب بھی نہیں ہوتا، چہ جائے کہ مخالفت مقصود ہو، مخالفت حنفیہ کی بات کرنا کسی بھی طرح سے عقل رکھنے والوں کے لیے روا نہیں، اس کے ساتھ اس مسئلہ میں ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ مشائخ کے یہاں ایک عام اصول ہے کہ جہاں رخصت اور عزیمت دونوں پہلوؤں پر عمل کی اجازت ہو وہاں وہ عزیمت پر عمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مسئلہ میں ایک طرف جلیل القدر تابعین عظام ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کے وجوب کے قائل ہیں جیسا کہ امام ابن المنذر، امام عسقلانی اور علامہ بدر الدین عینی نے لکھا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب اور عمر بن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ

ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا واجب ہے، اگرچہ یہاں لفظ ''واجب'' واجب اصطلاحی کے معنی میں نہیں ہے، پھر بھی لفظ واجب سے تاکیدی حکم ضرور نکل رہا ہے اور دوسری طرف **حی علی الفلاح** پر قیام کا حکم لفظ 'ینبغی' سے دیا جا رہا ہے، جو بہر حال لفظ واجب سے حکم میں نیچے کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جمہور علمائے اسلام یہ بھی کہتے ہیں کہ اقامت کے وقت مقتدی کب کھڑے ہوں؟ اس کا کوئی ذکر حدیث میں نہیں ہے، صرف امام کی عدم موجودگی میں کھڑے ہونے کی ممانعت ہے، لہٰذا اگر امام مسجد میں موجود ہو تو بھی أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ (المومنون: ٦١) (اہل ایمان بھلائی کی طرف لپکنے والے اور سبقت کرنے والے ہوتے ہیں۔) کی وجہ سے شروع اقامت میں ہی کھڑا ہونا زیادہ مناسب ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ یہ فرماتے تھے: **إذا سمعت النداء بالإقامة فكن أول من أجاب** (جب تم اقامت کی ندا سنو تو سب سے پہلے اس کی بجا آوری کرنے والا بنو۔) اور حنفیہ سے جو یہ منقول ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے اسے بقول امام طحطاوی استحباب کی آخری حد پر محمول سمجھا جائے نہ کہ ابتدا پر، یعنی اس سے بھی زیادہ تاخیر کرنا نماز کے لیے کھڑے ہونے میں موجود استحباب کو کھو دینا ہے۔ آج پوری دنیا کے اہل سنت بشمول احناف کا عمل اسی پر ہے۔ ہندوستانی اہل تصوف واہل سنت کے جو مراکز اعلی حضرت فاضل بریلوی کے فتاوے سے بہت زیادہ اثر پذیر نہیں ہوئے ان کے یہاں بھی یہی قدیم توارث قائم ہے۔ اس لیے ان کے اس عمل کو ترک استحباب اور اس سے بڑھ کر مخالفت احناف یا مخالفت اہل سنت پر محمول کرنے کی بجائے اسے عزیمت، مسارعت الی الصلاۃ، مسابقت الی الخیر، پوری دنیا کے اہل سنت اور احناف کی موافقت اور قدیم اہل سنت واہل تصوف کے طریق عزیمت کے اتباع پر محمول کرنا چاہیے۔

ہندوستان کی خانقاہوں اور علمی مراکز کا توارث

ہندوستان میں واقع علمی مراکز اور اکثر خانقاہیں ایسی تھیں جہاں ہمیشہ سے یہ توارث تھا کہ وہاں کے سجادگان اقامت کی ابتدا ہی میں کھڑے ہوتے تھےلیکن جس طرح خانقاہوں کے جانشیں ومتولی علم سے کورے اور عمل سے دور ہوتے گئے اسی قدر وہ لوگ اپنے آباواجداد کے علمی،عملی اوراعتقادی ورثہ سے ہاتھ دھوتے چلے گئے۔

اس کے باوجود بعض خانقاہیں ایسی ہیں جو اپنے توارث کو باقی رکھے ہوئی ہیں اور اس کے احیاکے لیے سعی پیہم کررہی ہیں،ہم ذیل میں ان ہی میں سے چند خانقاہوں کا ذکر کرتے ہیں جہاں آج بھی قدیم توارث کے اتباع میں امام ومقتدی ابتداے اقامت میں کھڑے ہوجاتے ہیں:

خانقاہ چشتیہ نظامیہ، دہلی:

اس خانقاہ کے مورث اعلی محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا(۷۲۵ھ) ہیں جن کے فیوض وبرکات سے خاندان چشت ہندو پاک میں پھلا اور پھولا۔

اس خانقاہ کے توارث کے سلسلے میں حضرت سید فرید احمد نظامی (درگاہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا، دہلی) سے بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اس خانقاہ کا توارث تھا کہ لوگ شروع اقامت میں کھڑے ہوتے تھے اور آج بھی یہ توارث قائم ودائم ہے۔ البتہ اب کچھ سالوں سے اس میں تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ کچھ لوگ بیٹھے رہتے ہیں اور کچھ لوگ کھڑے ہوں تو بھی بیٹھ جاتے ہیں۔لیکن ہمارے یہاں کا قدیم طریقہ شروع

اقامت میں ہی امام ومقتدی کا کھڑا ہونا متوارث ہے۔اور جہاں تک اذان ثانی کی بات ہےتو یہ پہلے اندر ہی ہوتی تھی اورآج بھی اندر ہی ہوتی ہے۔

خانقاہ شیخ سعد خیرآبادی، خیرآباد:

اس خانقاہ کے بانی جامع شریعت وطریقت شیخ سعدالدین خیرآبادی (۹۲۲ھ) ہیں، آپ کے یہاں بھی اب تک یہی معمول ہے کہ لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں اوراذان ثانی داخل مسجد ہوتی ہے۔

خانقاہ عالیہ صفویہ، صفی پور:

صفی پور ضلع اناؤ کا قدیم ترین قصبہ ہے، جو اناؤ سے ۲۷ /کیلومیٹر جانب مغرب میں واقع ہےاور اناؤ شمالی ہند کے کثیر آبادی والا صوبہ اتر پردیش کے دارالحکومت لکھنؤ سے جانب جنوب میں ۶۴ /کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہےاس قصبہ کا پرانا نام ''سائی پور'' تھا۔

ساتویں صدی ہجری میں ایک کامل صوفی حضرت شاہ اکرم عثمانی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (۶۷۵ھ) یہاں تشریف لائے،آپ کے ذریعہ اس خطہ میں اسلام کی تبلیغ ہوئی۔آپ کی چوتھی پشت میں حضرت شیخ عبدالصمد عرف مخدوم شاہ صفی قدس اللہ سرہ (۹۴۵ھ) پیدا ہوئے، بعد میں یہ قصبہ آپ کے نام نامی سے موسوم ہوا۔

اس خانقاہ کا عمل بھی یہ تھا کہ یہاں کے سجادگان اورمتولیان ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں حضرت افضال میاں قبلہ (خانقاہ صفویہ، صفی پور شریف) سے میری بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۸۳ء سے لوگ اقامت کے وقت بیٹھنے لگے ہیں، ورنہ اس سے پہلے سب لوگ اقامت کے شروع ہی میں کھڑے ہوتے تھے۔لیکن اذان ثانی آج بھی اندر ہی ہوتی ہے۔

خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ

خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ ملک کے معروف خانقاہوں میں سے ایک ہے،اس کے مورث اعلی صاحب سبع سنابل میر عبدالواحد بلگرامی ہیں جو مخدوم شاہ صفی صفی پوری کے مرید اورشاہ حسین سکندر آبادی کے خلیفہ تھے،اس طرح یہ خانقاہ بنیادی اعتبار سے چشتی خانقاہ ہے۔اور جب حضرت شاہ برکت اللہ پیمی قدس سرہ حضرت شاہ فضل اللہ کالپوی کی تربیت میں آئے جس کے بعد اس خانقاہ پر قادریت کا غلبہ ہو گیا۔ملک کے دو معروف علمی مراکز بدایوں اور بریلی کے پیر خانے کے طور پر بھی اس کی بڑی شہرت ہے۔اذان ثانی کے مسئلے میں یہاں کا توارث بھی عندالمنبر ہی رہا ہے۔بقول مولانا سید سبطین حیدر قادری برکاتی، آستانہ عالیہ برکاتیہ مارہرہ، حضرت آل رسول احمدی ان کے بعد حضرت شاہ ابوالحسین نوری اوران کے بعد حضرت شاہ مہدی میاں تک تو یہی عمل تھا، اس توارث سے عدول بعد میں ہوا ہے،اس لیے سید صاحب موصوف نے اب اپنی مسجد میں اپنے بزرگوں کی سنت کو زندہ بھی کر دیا ہے۔جس پر انہیں فخر بھی ہے،البتہ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں حی علی الفلاح پر ہی کھڑے ہوتے ہیں، تاہم اس مسئلے پر ہمارے یہاں کوئی شدت نہیں ہے۔ہم اس پر بھی تشدد نہیں کرتے جو آج کل رائج ہے، کہ اگر کوئی شروع اقامت میں کھڑا ہو جائے تو اسے پکڑ کر بٹھایا جاتا ہے یا اس پر وہابیت کی تہمت لگائی جاتی ہے،اس قسم کی شدت شرعی بھی ہمیں پسند نہیں۔

خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری، لکھنؤ:

قصبہ کاکوری صوبہ اتر پردیش کے قدیم،مشہور اور علمی قصبات میں سے ایک ہے، یہ قصبہ دارالحکومت اتر پردیش لکھنؤ سے ۲۱ /کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے،یہیں پر حضرت شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہ (۱۲۲۱ھ) نے ’’خانقاہ کاظمیہ قلندریہ‘‘ کی داغ بیل ڈالی، جو آج

بھی مرجع عوام وخواص ہے، یہاں کا بھی توارث یہی ہے کہ شروع اقامت ہی میں نمازی کھڑے ہوتے ہیں۔

خانقاہ وجیہیہ مجددیہ، رامپور:

اس خانقاہ کا توارث بھی شروع اقامت میں ہی کھڑا ہونا ہے، اس مسئلے کی بابت مفتی محبوب علی رامپوری ''فتاوی علماء رامپور'' میں لکھتے ہیں:

''اس میں موجودہ علما کا اختلاف ہے، مولوی احمد رضا خان صاحب فرماتے ہیں کہ امام بیٹھا رہے جب مکبر **حی علی الصلاۃ** پر پہنچے تب کھڑا ہو اور فقہ کی بعض عبارتوں سے ایسا دھوکہ بھی لگتا ہے کہ مستحب یہ ہے کہ امام **حی علی الصلاۃ** پر کھڑا ہو، مگر علماء رامپور وجمہور علماء کا طریقہ یہ ہے وہ ابتداء ہی سے کھڑے ہوجاتے ہیں، اس لیے ہم نے اس مسئلہ میں کافی تحقیق کی اور کتابوں کی ورق گردانی کی ،لہٰذا ہمارے علمائے رامپور وغیرہ کی تحقیق کے مطابق ہمیں ثبوت مل گیا اور فقہ کی دیگر عبارتوں میں صراحت کردی گئی کہ **حی علی الصلاۃ** پر کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ تاخیر نہ کرے، تاخیر کی یہ انتہا ہے، نہ کہ اول سے کھڑے ہونے کی ممانعت اور کفایہ میں ہے کہ سرعت امتثال اسی میں ہے کہ اول سے کھڑا ہو، اسی لیے یہ افضل ہے:

والقیام لإمام و مؤتم الخ مسارعة لامتثال أمره و الظاهر أنه احترازا عن التاخیر لا التقدیم حتی لو قام أول الإقامة لا بأس۔(۱)

اذان ثانی کے مسئلے پر علمائے رامپور نے اعلی حضرت فاضل بریلوی کے فتوے پر شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے جس پر ان کا موقف واضح ہے تاہم اختلاف ادب کی یہ تاریخ صد

(۱) طحطاوی علی الدر المختار (۱/ ۲۱۵)

فتاوی علماء رامپور: ص،۱۶/ ۱۷، زیر اہتمام: شعبہ نشر واشاعت، مدرسہ جامعہ العلوم فرقانیہ

ہزار داستان ہے جس میں بے شمار مقامات آہ وفغاں ہیں۔

خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، ضلع پٹنہ (بہار):

مولانا ہلال احمد قادری صاحب اقامت کے مسئلے میں فتوی جاری کرتے ہوئے اس خانقاہ کا توارث تحریر فرماتے ہیں کہ ''اقامت کے مسئلے میں شروع سے تمام بزرگوں کا عمل یہ رہا ہے کہ وہ شروع اقامت میں کھڑے ہوکر صفیں درست کراتے اور اقامت ختم ہونے پر نماز شروع کرتے تھے، خانقاہ کے تمام بزرگوں کا عمل اقامت کے وقت کھڑے رہنے کا ہے اور آج بھی خانقاہ کی مسجد میں یہی معمول ہے۔

ابتدائے اقامت میں بیٹھے رہنا یا امام کا مسجد میں آکر اپنی جگہ پر بیٹھ جانا حدیث سے ثابت نہیں ہے، ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوجانا ہی مسنون ہے''۔(۱)

خانقاہ منعمیہ، پٹنہ:

خانقاہ منعمیہ، متن گھاٹ، پٹنہ کا شمار بہار کی بڑی خانقاہوں میں ہوتا ہے، بانیٔ خانقاہ حضرت شاہ منعم پاک (۱۱۸۵ھ) بارہویں صدی کے جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں، اس آستانے کے موجودہ صاحب سجادہ معروف عالم دین، صوفی، خطیب، داعی، ڈاکٹر سید شمیم الدین منعمی ہیں، جب ان سے ان کے خانقاہ کے توارث کے سلسلے میں گفتگو کی گئی تو انھوں نے بتایا کہ اذان ثانی کا معمول ہمارا عندالمنبر ہی ہے اور اسی پر ہم آج بھی قائم ہیں معروف عالم دین علامہ ارشد القادری بھی ہماری یہاں آتے رہے، ہماری مسجد میں تقریر کی اور منبر کے قریب اذان ثانی ہوئی، لیکن کبھی اس مسئلے پر کچھ بھی نہیں کہا، البتہ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں ہمارا توارث متروک ہے، ہمارے مشائخ ابتدا سے اقامت میں کھڑے ہوتے رہے۔ ہمارے والد صاحب کے زمانے میں اس میں

---

(۱) سہ ماہی المجیب، مارچ ۲۰۰۳ء، از ہلال احمد قادری

تبدیلی آئی اور اس تبدیلی کی وجہ یہ بنی کہ والد صاحب نے اس مسئلے پر تحقیق کرائی، ساری کتابیں تلاش کی گئیں ان میں ایک کتاب مولانا ظفر الدین بہاری کی ملی جو اقامت کے مسئلے میں ہے، اس میں عالم گیری کے حوالے سے ہے، کہ شروع میں کھڑا رہنا مکروہ ہے، اسی لیے والد صاحب نے بھی کہا کہ ہم لوگ بھی حی علی الصلوۃ پر کھڑے ہوں گے، لیکن ہم کسی کے اندھے مقلد نہیں ہیں۔ آج اس کے خلاف کوئی مضبوط بات آتی ہے تو ہم اس پر غور کریں گے۔

خانقاہ قادریہ، بدایوں:

یہ ہندوستان کی مشہور خانقاہوں میں ایک ہے، یہاں سے ایک عرصہ سے خلق خدا علمی وروحانی فیض پا رہی ہے۔

اذان ثانی کے مسئلے میں اعلی حضرت بریلوی سے اس خانقاہ کا اختلاف معروف ومشہور ہے، اقامت کے سلسلے میں بھی وہاں کا عام معمول یہی ہے کہ صاحب سجادہ جب تشریف لاتے ہیں تو ان کو دیکھتے ہی لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور اقامت بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں یہاں کے ایک ذمہ دار شخص سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ ہمارے یہاں پہلے بھی اور آج بھی لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی پر کوئی جبر نہیں ہے جو جب چاہے کھڑا ہو، کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ہمارے بزرگوں کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔

جنوب ہند کا توارث:

جن شخصیتوں نے جنوب ہند کی امامت و پیشوائی کی، ان میں ایک بڑا نام شیخ الاسلام انوار اللہ شاہ فاروقی کا ہے۔ آپ نے جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی بنیاد رکھی، آپ علوم ظاہری میں یدطولی رکھتے تھے اور علوم باطنی کے شہسوار بھی تھے۔ حضرت شیخ الشیوخ حاجی

امداد اللہ مہاجر مکی سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور بہت سے مسائل میں آپ اپنی تحقیقی رائے رکھتے تھے۔ پورا جنوب ہند آپ سے متاثر تھا اور آپ کے فتوی پر عامل بھی۔

آپ بھی اذان عند المنبر کے قائل تھے، آپ ہی کے حکم سے مولانا معین الدین اجمیری نے **القول الاظہر فیما یتعلق بالاذان عند المنبر** تصنیف کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جنوب ہند کی مسجدوں میں اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی۔ لیکن موجودہ زمانے میں ان میں سے کچھ نے اپنے توارث کو چھوڑ دیا ہے۔

خانقاہ سلیمانیہ، تونسہ شریف، پاکستان

تونسہ، پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان میں واقع ایک شہر ہے۔

غوث زمان حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی (۱۱۸۳-۱۲۶۷ھ) سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ایک نامور بزرگ رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان اور افغانستان میں سیکڑوں مشائخ آپ کو اپنا روحانی مورث تسلیم کرتے ہیں۔ ۱۲۱۴ھ میں آپ رشد وہدایت کے لیے شیخ کے حکم سے تونسہ میں قیام پزیر ہوئے۔

مشہور ومعروف کتاب شناس اور درگاہ شریف کے مستقل حاضر باش مولانا رمضان علی معینی سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ پاکستان کی اکثر خانقاہوں میں بالعموم اور چشتیہ سلسلے کی خانقاہوں میں بالخصوص آج بھی جمعے کی اذان ثانی اندر ہوتی ہے اور لوگ ابتدائے اقامت ہی میں کھڑے ہوتے ہیں، ہمارے یہاں بھی شروع سے یہی معمول ہے۔

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں الہ باد:

سید سراواں، الہ آباد کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ یہ قصبہ دلی کولکاتا ریلوے لائن پر الہ آباد شہر سے تقریباً ۲۲ر کیلومیٹر کی دوری پر جانب مغرب واقع ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے

عظیم صوفی عارف ربانی سید محمد بن علی بن العلاء حسینی سبزواری معروف بہ سید حقانی قدس سرہٗ نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنایا اور دیکھتے دیکھتے یہ خطۂ ارض مخلوق خدا کے رشد و ہدایت اور عقیدتوں کا مرکز بن گیا۔ یہ قصبہ آپ ہی کی طرف منسوب ہوکر ''سید سراواں'' کہلایا۔

سلطان العارفین شاہ عارف صفی محمدی قدس سرہٗ (۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۳ء) نے انیسویں صدی عیسوی میں ایک طرح سے آپ ہی کے دعوتی اور تبلیغی مشن کی نشاۃ ثانیہ کی اور ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء میں مخلوق کی روحانی تشنگی بجھانے کی خاطر سید صاحب کے مزار اقدس کے قریب ہی خانقاہ عارفیہ کی بنیاد رکھی۔ خانقاہ عالیہ عارفیہ کا تعلق مشہور روحانی سلسلہ، چشتیہ صفویہ سے ہے۔ حضرت سلطان العارفین کو خرقۂ اجازت و خلافت، حضرت شاہ عبد الغفور محمدی بارہ بنکوی قدس سرہٗ (۱۳۲۴ھ) سے حاصل تھا جو حضرت مخدوم شاہ محمد خادم صفی محمدی صفی پوری قدس اللہ سرہٗ (۱۲۸۷ھ) کے مرید و خلیفہ تھے۔ یہ روحانی سلسلہ، شیخ الاسلام حضرت مخدوم عبد الصمد شاہ صفی (۹۴۵ھ)، وارث الانبیا حضرت مخدوم شیخ سعد خیرآبادی (۹۲۲ھ) اور قطب العالم حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی (۸۸۴ھ) قدست اسرارہم کے واسطوں سے ہوتا ہوا سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہٗ (۷۲۵ھ) تک پہنچتا ہے۔

اس خانقاہ کے موجودہ صاحب سجادہ داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی ہیں۔ اس خانقاہ میں بھی شروع سے ہی خطبۂ جمعہ کی اذان مسجد کے اندر ممبر کے سامنے ہوتی ہے اور اقامت کے مسئلے میں اس کا توارث یہ ہے کہ اقامت ہوتے ہی سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور آج بھی داعی اسلام اپنے اسی توارث پر عمل پیرا ہیں۔ آپ کا طریقہ یہ ہے کہ آپ مسجد سے متصل بائیں جانب حجرے سے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، آپ کو دیکھتے ہی اقامت شروع ہوجاتی ہے اور سب لوگ کھڑے ہوجاتے

ہیں۔ یہ عین سنت نبوی ہے جس میں کسی فقیہ کو اختلاف نہیں اور یہ سنت میری نظر میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ظہر وعصر میں آپ سیدھے مصلے پر چلے جاتے ہیں اور صف کی درستگی کے بعد نماز کی امامت فرماتے ہیں جب کہ مغرب،عشاء اور فجر میں آپ کے حکم سے کوئی اور امامت کرتا ہے۔ جمعہ کے دن آپ مسجد میں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔امام خطبہ دینے کے بعد مصلے پر چلا جاتا ہے، بیٹھتا نہیں ہے،اس لیے آپ بھی کھڑے ہوجاتے ہیں،ساتھ ہی تکبیر بھی شروع ہوجاتی ہے اور سب لوگ کھڑے بھی ہوجاتے ہیں یہ طریقہ بھی فقہا کی تصریحات کے مطابق سب سے اولی ہے، کیوں کہ جیسا کہ اس سے ماقبل مذکور ہوا کہ خطبہ کے بعد مصلی پر امام کا بیٹھنا اور پھر بیٹھ کر اقامت سننا یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہے۔

یہی یہاں کا ہمیشہ سے توارث رہا ہے، یہاں یہ بھی واضح کردیں کہ داعی اسلام اگرچہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں،لیکن آپ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے والے پر نکیر نہیں فرماتے، بلکہ آپ کا معمول یہ بھی ہے کہ اگر آپ ایسی جگہ جاتے ہیں جہاں لوگ **حی علی الفلاح** پر کھڑے ہوتے ہیں تو آپ بھی ان کے ساتھ **حی علی الفلاح** ہی پر کھڑے ہوتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ یہ ایک استحبابی مسئلہ ہے لہٰذا جہاں کا جو رواج ہو اسی پر عمل کرنا چاہیے اور شدت برتنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

خانقاہوں کے اس توارث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر منبر کے سامنے دیا جانا اور شروع اقامت میں کھڑا ہونا کوئی آج کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ زمانہ قدیم سے ہی مشائخ کا معمول رہا ہے۔

اس لئے اس مسئلے میں شدت نہیں ہونی چاہئے۔اس سلسلے میں بعض علما کا جو اختلاف ہے اس کی نوعیت محض استحباب سے متعلق ہے،جیسا کہ وحدت میں،جبکہ اتحاد اہل سنت اور محبت وموالات مسلمین فرض و واجب ہے،غرض فرض چھوڑ کر استحباب کے مسئلے پر

جنگ سراسر نادانی ہے،استحبابی مسئلے میں جس کی جو تحقیق ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔لیکن دوسروں کو اسے منوانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔اللہ کریم ہمیں اپنی بندگی، اپنے حبیب کی محبت و اطاعت اور مشائخ کی پیروی پر قائم رکھے۔اور ہم مسلمانوں کو ایک اور نیک رکھے، نفس کی بندگی سے آزادی دے اور اپنی بندگی کا خوگر بنائے، آمین یا رب العالمین بسید المرسلین علیہ وعلیٰ الہ افضل الصلوۃ وادوم التسلیم

کیا یہ مسئلہ ضروریات اہل سنت اور شعار سنیت سے متعلق ہے؟

ضروریات اہل سنت کا مفہوم:

بعض لوگ ان مسائل کو ضروریات اہل سنت سے شمار کرتے ہیں اس لیے سب سے پہلے ضروریات اہل سنت کی تفہیم اور تعریف واضح کردی جائے تاکہ اس الزام کی حقیقت سامنے آجائے۔

ہم ضروریات اہل سنت کی تعریف وتوضیح کے لیے ''فتاوی رضویہ'' کی عبارت من وعن پیش کررہے ہیں:

مانی ہوئی باتیں چار قسم ہوتی ہیں۔

(۱) ضروریاتِ دین:

ان کا ثبوت قرآن عظیم یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی قطعیات الدلالات، واضحۃ الافادات سے ہوتا ہے جن میں نہ شبہے کی گنجائش، نہ تاویل کو راہ۔ اور ان کا منکر یا ان میں باطل تاویلات کا مرتکب کافر ہوتا ہے۔

(۲) ضروریاتِ مذہبِ اہلسنت وجماعت:

ان کا ثبوت بھی دلیل قطعی سے ہوتا ہے۔ مگر ان کے قطعی الثبوت ہونے میں ایک نوعِ شبہہ اور تاویل کا احتمال ہوتا ہے اسی لیے ان کا منکر کافر نہیں بلکہ گمراہ، بدمذہب، بددین کہلاتا ہے۔

(۳) ثابتات محکمہ:

ان کے ثبوت کو دلیل ظنی کافی، جب کہ اس کا مفاد اکبر رائے ہو کہ جانب خلاف کو

مطروح و مضمحل اور التفاتِ خاص کے نا قابل بنا دے۔ اس کے ثبوت کے لیے حدیث احاد، صحیح یا حسن کافی، اور قول سوادِ اعظم و جمہور علماء کا سندِ وافی، **فانّ ید اللہ علی الجماعۃ** (اللہ تعالی کا دستِ قدرت جماعت پر ہوتا ہے۔)

ان کا منکر وضوحِ امر کے بعد خاطی و آثم خطا کار و گناہ گار قرار پاتا ہے، نہ بد دین و گمراہ، نہ کافر و خارج از اسلام

(۴) ظنّیات محتملہ:

ان کے ثبوت کے لیے ایسی دلیل ظنّی بھی کافی، جس نے جانبِ خلاف کے لیے بھی گنجائش رکھی ہو، ان کے منکر کو صرف مخطی و قصور وار کہا جائے گا نہ گنہگار، چہ جائیکہ گمراہ، چہ جائیکہ کافر۔

ان میں سے ہر بات اپنے ہی مرتبے کی دلیل چاہتی ہے جو فرقِ مراتب نہ کرے اور ایک مرتبے کی بات کو اس سے اعلی درجے کی دلیل مانگے وہ جاہل بے وقوف ہے یا مکّار فیلسوف ع

ہر سخن وقتے ہر نکتہ مقامے دارد

(ہر بات کا کوئی وقت اور ہر نکتے کا کوئی خاص مقام ہوتا ہے۔)

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

(اگر تو مراتب کے فرق کو ملحوظ نہ رکھے تو زندیق ہے)(۱)

ان چاروں قسموں پر غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلے کا تعلق ''ضروریات دین'' سے نہیں ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے، اسی طرح اس کا تعلق ''ضروریات اہل سنت'' سے بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ ضروریات اہل سنت ہونے کے لیے بھی ''دلیل قطعی'' چاہیے، جب کہ **حی علی الفلاح** پر قیام کے ثبوت کے لیے کوئی ''دلیل قطعی'' نہیں ہے۔

---

(۱) فتاوی رضویہ، ج، ۲۹، ص: ۳۸۵

اس مسئلے کو ''ثابتات محکمہ'' کے خانے میں بھی نہیں رکھ سکتے ؛ کیوں اس کے ثبوت کے لیے بھی ''حدیث احاد، صحیح ، یا حسن، یا سواد اعظم اور جمہور علما'' کا قول چاہیے، حالانکہ اس کا ثبوت ان میں سے کسی چیز سے نہیں ہے۔ البتہ اس کو ''ظنیات محتملہ'' کی فہرست میں شامل کر سکتے ہیں، لہٰذا بر سبیل تنزل ''حی علی الفلاح پر قیام کا ثبوت ''ظنیات محتملہ'' کے قبیل'' سے ہے ،تب بھی اس کے خلاف عمل کرنے والے گنہگار نہیں ہیں، چہ جائیکہ گمراہ، چہ جائیکہ کافر، کیوں کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والوں کے پاس بھی دلائل موجود ہیں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اور وہ حضرات اہل سنت ہی نہیں اساطین اہل سنت اور مقتدایان امت ہیں۔

یہاں یہ بات بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ بعض لوگ ایک ایسے مسئلے کو ضروریات اہل سنت سے شمار کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس پر مذاہب اربعہ میں الگ الگ آرا موجود ہیں۔ اس مسئلے کو ضروریات اہل سنت یا شعار سنیت سے متعلق کرنے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ امت کے اساطین سنت کو سنیت سے خارج کرنے کی سعی نامشکور کی جا رہی ہے۔

تشبہ اہل بدعت کا مفہوم:

مسئلہ اقامت کے سلسلے میں بعض لوگ یہ وسوسہ چھوڑتے ہیں کہ ابتدائے اقامت ہی سے کھڑا ہونے میں اہل بدعت سے مشابہت ہوتی ہے، اس لیے **حی علی الفلاح** پر ہی کھڑا ہونا چاہیے، لہٰذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے بھی کچھ باتیں عرض کروں، کہ مشابہت کی حد کیا ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے؟ کن چیزوں میں مشابہت باعث ضلالت ہوتی ہے؟

اس تعلق سے بھی میں اپنی بات پیش کرنے سے زیادہ ، فاضل بریلوی کے والد محترم مولانا نقی علی خان رحمۃ اللہ علیہما کی بات پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جس کو انھوں نے قدرے تفصیل کے ساتھ ''اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد'' میں لکھا ہے۔ آپ قاعدہ نمبر ۶

کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''مشابہت کفار ومبتدعین کی ممانعت چند امور پر موقوف:

اولاً: نیت وقصد مشابہت ؛**لأن الأعمال بالنیات، ولکل امرء ما نوی، وفی ''الأشباہ'' الأمور بمقاصدھا و ''فی الدر المختار'' ناقلا عن ''البحر'' ''فإن التشبہ بھم لا یکرہ فی کل شیء بل فی المذموم وفیما یقصد بہ التشبہ''**

[اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے ہر شخص کو اس کی نیت کا بدلہ ہی ملتا ہے اور اشباہ میں ہے: تمام امور اپنے مقاصد کے تحت ہیں، درمختار میں البحر الرائق کے حوالے سے ہے: کفار ومبتدعین سے مشابہت ہر چیز میں مکروہ نہیں ہے، بلکہ مذموم چیزوں میں مکروہ ہے اور ان چیزوں میں مکروہ ہے جن میں مشابہت کی نیت کی گئی ہو۔]

حدیث: (**من تشبہ بقوم فھو منھم**) اور دیگر احادیث میں جو ممانعتِ مشابہت میں ہیں جیسے حدیث (**لیس منا من تشبہ بغیرنا**) اور (**لا تشبھوا بالیھود والنصاری**) لفظِ تشبہ وارد، خاصہ باب تفعل کا تکلف، **کتمرض وتکوف: أی أظھر نفسہ مریضًا وکوفیًا ولم یکن**

[ان تمام نصوص میں لفظ تشبہ آیا ہے جو باب تفعل سے ہے جس کے مفہوم میں تکلف کا معنی پایا جاتا ہے، مثلاً تمرض کے معنی ہیں، بتکلف مریض بننا۔ تکوف کا معنی ہیں بتکلف کوفی بننا جب کہ حقیقتاً نہ مریض ہو اور نہ کوفی ہو۔]

بیسوں عبادات اور صدہا معاملاتِ اہل اسلام وکفار مبتدعین باہم متشابہ یا متحد ہیں، مگر بدون نیت وقصدِ مشابہت باتفاق فریقین حرام ومکروہ نہیں....الخ

دوم: جس فعل میں مشابہت واقع ہے، شعارِ مذہب ان کا ہو، **صرح بہ العلماء فی ''شرح الفقہ الاکبر'' لمولانا علی القاری رحمہ اللہ :أنا ممنوعون من التشبہ**

بالكفرة و أهل البدعة فی شعارهم، لا منهيون عن كل بدعة، ولو كانت مباحة، سواء كانت من أفعال أهل السنة أو من أفعال الكفرة وأهل البدعة، فالمدار على الشعار''...الخ

[اس بات کی علما نے صراحت کی ہے اسی معاملہ میں مشابہت ممنوع ہے جو کفار و مبتدعین کا شعار ہو، ملاعلی قاری کی شرح فقہ اکبر میں ہے، ہمیں کفار اور اہل بدعت کی شعار میں مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔ ہر بدعت میں مشابہت سے نہیں روکا گیا ہے، خواہ وہ بدعت اہل سنت کے افعال میں ہو، کفار کے افعال میں ہو یا اہل بدعت کے افعال میں ہو۔ لہٰذا ممانعت کی بنیاد شعار ہے۔]

سوم: خصوصیت فعل کی کسی فرقہ مخالف کے ساتھ اور ممانعت مشابہت کی اس میں خاص اس حالت میں متصور کہ اِحداث اُس فعل کا اُس فرقہ سے ثابت ہو، ورنہ ہمیں ترک اپنی عادت کا کہ کفار اہل بدعت بہ تقلید واقتدا ہماری اختیار کرلیں ضرور نہیں۔

چہارم: اگر عادت کفار ومبتدعین کی بدل جائے اور اب ان میں عادت ورواج نہ رہے، یا رواج عام ہونے سے خصوصیت ان کے ساتھ باقی نہ رہے یہاں تک کہ شعار ان کا نہ سمجھا جائے، تو حکم بھی نہ رہے گا۔''...الخ (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مشابہت متحقق ہونے کے لیے چار چیزیں درکار ہیں، جیسا کہ مولانا کے مذکورہ اقتباسات سے معلوم ہوا، اب اگر ہم مسئلہ اقامت کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان چاروں چیزوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں پائی جاتی ہے۔

پہلی شرط یہ تھی کہ''نیت وقصد مشابہت ہو'' یہ شرط مفقود ہے، کوئی بھی اہل بدعت سے مشابہت کی بنا پر ابتدا میں قیام نہیں کرتا۔

---

(۱) اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد: ص، ۱۴۹ / ۱۵۰ / ۱۵۲ / ۱۵۳

دوسری شرط یہ تھی کہ ’’جس فعل میں مشابہت واقع ہے شعار مذہب ان کا ہو‘‘ یہ شرط بھی مفقود ہے، کیوں کہ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا اہل بدعت کا شعار نہیں ہے، کیوں کہ اہل سنت وجماعت ۔کبار تابعین اور حنفی ،مالکی ،شافعی ،حنبلی ۔کی اکثریت ابتدا ہی میں کھڑے ہونے پر عامل ہے،فقہائے احناف میں سے ایک نامور فقیہ امام طحطاوی (۱۲۳۱ھ) حنفیہ کے مذہب کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جتنی جلد کھڑا ہو بہتر ہے،البتہ حی علی الفلاح سے تاخیر نہ کرے کہ وہ خلاف استحباب ہے۔چنانچہ آپ ’’درمختار‘‘ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

و القیام لامام و مؤتم الخ مسارعة لامتثال امره و الظاهر انه احترازا عن التاخیر لا التقدیم حتی لو قام اول الاقامة لا باس (۱)

امام اور مقتدی کا کھڑا ہونا، الخ امتثال حکم میں جلدی کرنا ہے،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا یہ تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا ،لہٰذا کوئی اگر ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

مزید یہ کہ ہندو پاک میں پہلے علما و مشائخ کا اسی پر عمل رہا ہے اور آج بھی بہت سی خانقاہوں میں اسی پر عمل ہے۔نیز برصغیر سے باہر عالم اسلام میں اہل سنت و اہل تصوف بلکہ عام اہل اسلام کا اسی پر عمل ہے۔

تیسری شرط یہ تھی کہ ’’خصوصیت فعل کی کسی فرقہ مخالف کے ساتھ اور ممانعت مشابہت کی اس میں خاص اس حالت میں متصور کہ اِحداث اُس فعل کا اُس فرقہ سے ثابت ہو‘‘ اس مسئلہ اقامت میں یہ تیسری شرط بھی نہیں پائی جاتی، کیوں کہ اس کا مُحدِث فرق باطلہ نہیں ہیں، بلکہ یہ مسئلہ سلف سے چلا آ رہا ہے،جیسا کہ میں نے ماقبل میں بیان کر دیا ہے کہ

(۱) طحطاوی علی الدر المختار (۱/ ۲۱۵)

حضرت سعید بن مسیب، عمر بن عبد العزیز، امام زہری اور دیگر لوگوں کا بھی یہی عمل رہا ہے۔

چوتھی شرط یہ تھی کہ ’’اگر عادت کفار ومبتدعین کی بدل جائے اور اب ان میں عادت ورواج نہ رہے، یا رواج عام ہونے سے خصوصیت ان کے ساتھ باقی نہ رہے یہاں تک کہ شعار ان کا نہ سمجھا جائے، تو حکم بھی نہ رہے گا‘‘

یہ شرط بھی اقامت کے مسئلے میں نہیں پائی جاتی، کیوں کہ یہ اہل بدعت کا نہ شعار ہے اور نہ صرف ان ہی کا رواج، بلکہ اہل سنت وجماعت کے یہاں بھی مسئلے کی یہ صورت رائج ہے۔ ہاں جو لوگ اہل سنت کو کسی ایک عالم کی فکر میں منحصر مانتے ہیں اور کسی فقیہ یا خانقاہ سے وابستگی کو ہی سنت سمجھتے ہیں ان کی سمت الگ ہے، انہیں ضرور شبہہ اور تشبہ لاحق ہوگا۔

ان تشریحات کی روشنی میں یہ واضح ہوگیا کہ مسئلہ اقامت کا اہل بدعت کے ساتھ مشابہت کسی درجے میں نہیں ہے، لیکن ہمارے یہاں المیہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اہل بدعت کے ساتھ مشابہت کا ٹیگ لگا دیتے ہیں، پھر اس کو حرام بلکہ کفر تک پہنچا دیا جاتا ہے، اللہ ہم سب کو اس علمی بحران اور اخلاقی دیوالیہ پن سے بچائے۔ آمین!

حاصل کلام

✲ مسئلۂ اذان و اقامت فرعی و استحبابی اور مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

✲ خارج مسجد اذان دینا، عہد رسالت وخلفاے راشدین کی سنت ہے۔

✲ اذان خطبہ کا داخل مسجد ہونے پر دوسری صدی سے علما و مشائخ کا معمول رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا مقصد صرف حاضرین مسجد کو سماعت خطبہ کے لیے متوجہ کرانا ہے۔

✲ اذان خطبہ کو بدعت سیئہ کہہ کر رد کرنا دوسری صدی سے آج تک کے تمام بلاد عالم کے علما و مشائخ کی ایک گونا توہین ہے۔

✲ اذان کا مقصود شرعی؛ اعلام و اعلان ہے جو مائک سے دی جانے والی اذان سے حاصل ہے خواہ وہ کہیں سے دی جائے، داخل مسجد سے یا خارج مسجد سے۔ اب اس مسئلے پر بحث وجدل کرنا کسی طرح جائز نہیں بلکہ انتشار وافتراق کا سبب ہے جو یقینا معیوب ہے۔

✲ بعض مجتہدین تابعین کے نزدیک ابتداے اقامت میں کھڑا ہونا واجب ہے اور اکثر مجتہدین اور جمہور ائمہ مذاہب کے نزدیک مستحب ہے جب کہ احناف کے نزدیک اس مسئلہ میں قدرے تفصیل ہے۔

✲ فقہ حنفی میں اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ دو صورتوں میں ابتداے اقامت میں اور ایک صورت میں حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا مستحب ہے۔ تاہم پہلے کھڑے ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

✲ خیر کی طرف جلدی کرنے اور تعدیل صفوف کی وجہ سے ہند و پاک کی اکثر

خانقاہوں کا معمول ابتداے اقامت میں کھڑے ہونے کا رہا ہے۔

✲ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اقامت کے وقت بیٹھنا ثابت نہیں۔

✲ اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو اس کے لیے پہلے سے کھڑا ہو کر انتظار کرنا اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا ہے اس لیے ایسی صورت میں پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ ورنہ ابتداے اقامت میں کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

حرفِ اختتام

ان تمام مباحث کا حاصل یہ ہے کہ یہ ایک استحبابی مسئلہ ہے لہٰذا جولوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں، انہیں چاہئے کہ وہ **حی علی الفلاح** پر کھڑے ہونے والے پرلعن طعن نہ کریں اور جولوگ **حی علی الفلاح** پر کھڑے ہوتے ہیں انہیں چاہیے کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والے پرنکیر نہ کریں، کیوں کہ دلائل جواز اور وجوہ ترجیح دونوں کے پاس موجود ہیں، اختلاف صرف استحباب میں ہے اور استحباب کا حکم ماقبل میں گزر چکا، البتہ ان نئے طریقوں سے بچنا چاہیے جن کا ذکر نہ احادیث کریمہ میں ملتا ہے اور نہ ہی صحابہ وتابعین اور فقہائے امت کے یہاں، جیسا کہ ہمارے یہاں بعض مسجدوں میں یہ ہوتا ہے کہ امام اپنے حجرے سے نکلتے ہیں اور مصلی پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر مکبر تکبیر کہتا ہے، پھر سب لوگ **حی علی الفلاح** پر کھڑے ہوتے ہیں اور اگر امام، صاحبِ حیثیت اور پیر ہوتو امام صاحب کو آتے دیکھ کر سب مقتدی کھڑے ہوجاتے ہیں، پھر سب بیٹھ جاتے ہیں، اس کے بعد مکبر تکبیر کہتا ہے، تب سب لوگ **حی علی الفلاح** پر کھڑے ہوتے ہیں، یہ ایک غیر ضروری رسم پرستی ہے، اس کا ثبوت نہ احادیث کریمہ میں ملتا ہے اور نہ فقہ کی کسی کتاب میں۔

لیکن اس کے باوجود اگر کوئی اپنے طریقے کے مطابق عمل پیرا ہے تو اس میں اس سے کوئی تعرض کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے لیے بحث ومباحثہ کیا جائے۔ اس قسم کے مسائل کو لے کر نزاعی صورتِ حال پیدا کرنا، کسی کی سنیت

اور ضلالت کا فیصلہ کرنا، اہل سنت کے بیچ شگاف ڈالنا ،فتوی بازی کرنا،تعلقات توڑنا، یہ نادانی کےسوا کچھ بھی نہیں ہے۔

میں نے اس مسئلے میں اتنی تفصیل اس لیے کی کہ لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والے اہل سنت پر طعنہ زنی نہ کریں اور نہ ہی مشق ستم بنائیں اور نہ ہی اس مسئلےکوفرض وواجب کا درجہ دیں ۔جولوگ اس مسئلے کے ساتھ فرض وواجب کا سا معاملہ کرتے ہیں ان سے میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس مسئلے کی نوعیت اور اس کی حقیقت کو سمجھیں اور کسی پر لعن طعن اور کسی کی سنیت داغ دار کرنے کی بے جا جسارت سے اجتناب کریں ۔اور اللہ کے حضور جواب دہی کو پیش نظر رکھیں ۔اس وقت اہل اسلام داخلی و خارجی سطح پر مختلف مسائل سے دو چار ہیں، اہل سنت ضعف واضمحلال اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں، ایسے میں اس قسم کے فرعی واستحبابی مسائل کو بنیاد بنا کر اہل اسلام اور اہل سنت کو خانوں میں بانٹنے کی کوشش سے اللہ تعالی ہمیں محفوظ رکھے۔مولیٰ کریم ہمیں حق کہنے، سننے لکھنے،سمجھنے اور قبول کرنے کی توفیق بخشے ۔(آمین)

مصادر ومراجع

اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد، نقی علی خان بریلوی (۱۲۹۷ھ) امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف ۱۴۳۰ھ

الاجوبۃ النافعۃ عن اسئلۃ لجنۃ مسجد الجامعۃ، ابوعبد الرحمن محمد ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ) مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع ۱۴۲۰ھ

الاستذکار، ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم قرطبی (۴۶۳ھ) دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۲۱ھ

الاعتصام، ابراہیم بن موسی بن محمد اللخمی الغرناطی الشہیر بالشاطبی (۷۹۰ھ) دار ابن عفان، السعودیۃ، طبع اول، ۱۴۱۲ھ

الاوسط فی السنن والاجماع، حافظ ابن المنذر نیسابوری، ابوبکر محمد بن ابراہیم (۳۱۹ھ) دار طیبۃ، الریاض ۱۴۰۵ھ

البیان والتحصیل والشرح والتوجیہ والتعلیل لمسائل المستخرجۃ، ابوالولید محمد بن أحمد بن رشد قرطبی (۵۲۰ھ) دار الغرب الاسلامی، بیروت، طبع دوم ۱۴۰۸ھ

البحر الرائق، زین الدین ابن نجیم حنفی (۹۷۰ھ)، دار المعرفۃ

البدایۃ والنہایۃ، ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر (۷۷۴ھ) دار الفکر ۱۴۰۷ھ

البنایۃ شرح الہدایۃ، ابومحمد محمود بن احمد بن موسی بن احمد بن حسین حنفی معروف بہ بدر الدین عینی (۸۵۵ھ) دار الکتب العلمیۃ ۱۴۲۰ھ

التمہید لمافی الموطامن المعانی والاسانید، ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر قرطبی (۴۶۳ھ) وزارۃ عموم الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ۔مغرب ۱۳۸۷ھ

التوضیح لشرح الجامع الصحیح، ابن الملقن سراج الدین ابوحفص عمر بن علی (۸۰۴ھ) دار النوادر، دمشق، ۱۴۲۹ھ
الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، عبدالقادر بن محمد بن نصر اللہ، ابومحمد، محیی الدین حنفی (۷۷۵ھ) میر محمد کتب خانہ، کراچی
الدر المختار شرح تنویر الابصار، علاء الدین حصکفی محمد بن علی بن محمد حنفی (۱۰۸۸ھ)
الطبقات الکبری، محمد بن سعد بن منیع ابوعبداللہ البصری الزہری، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۸ء
العنایۃ شرح الہدایۃ، محمد بن محمد بن محمود، اکمل الدین ابوعبداللہ ابن الشیخ شمس الدین ابن الشیخ جمال الدین الرومی البابرتی، دار الفکر (۷۸۶ھ)
الفتاوی الہندیۃ، لجنۃ علماء برئاسۃ نظام الدین بلخی، دار الفکر ۱۳۱۰ھ
الفقہ الاسلامی وادلتہ، ڈاکٹر وھبہ زہیلی (۱۴۳۶ھ)، دار الفکر، سوریہ، طبع چہارم
الکافی فی فقہ اہل المدینہ، ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر القرطبی مالکی (۴۶۳ھ) الریاض الحدیثۃ، الریاض، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء
المبسوط، محمد بن احمد بن ابی سہل شمس الائمۃ سرخسی (۴۸۳ھ) دار المعرفۃ، بیروت
المبسوط، محمد بن الحسن الشیبانی ابوعبداللہ (۱۸۹ھ) ادارۃ القرآن، کراچی
المدخل، محمد بن محمد عبدری مالکی معروف بہ ابن الحاج (۷۳۷ھ): دار التراث، بیروت
المستدرک، محمد بن عبداللہ ابوعبداللہ الحاکم نیساپوری (۴۰۵ھ) دار الکتب العلمیۃ
المصنف، ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام بن نافع حمیری یمانی (۲۱۱ھ) المجلس العلمی، الہند
المعجم الکبیر، سلیمان بن احمد شامی، ابوالقاسم طبرانی (۳۶۰ھ) مکتبہ ابن تیمیۃ، القاہرۃ
المقاصد الحسنۃ، شمس الدین ابوالخیر محمد بن عبدالرحمن سخاوی (۹۰۲ھ) دار الکتاب العربی
المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، ابوزکریا محیی الدین یحیی بن شرف نووی (۶۷۶ھ) دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۹۲ھ
بہار شریعت، محمد امجد علی اعظمی بن جمال الدین (۱۳۶۷ھ) مکتبۃ المدینۃ ۱۴۲۹ھ

تذکرۃ الحفاظ،شمس الدین ابوعبداللہ محمد ذہبی (۷۴۸ھ) دارالکتب العلمیۃ ۱۴۱۹ھ
جامع المضمرات والمشکلات، یوسف بن عمر صوفی (۸۳۲ھ) مخطوطہ: یہ اس سائٹ پر دستیاب ہے۔ http://wqf.me://15885=p?
جمع الجوامع، امام جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) الازہر الشریف، ۲۰۰۵ء
حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار، احمد بن محمد بن اسماعیل طحطاوی (۱۲۳۱ھ)، مصر ۱۲۵۴ھ
حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبھانی (۴۳۰ھ) السعادۃ بجوار محافظۃ مصر، ۱۳۹۴ھ
خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، سید محمد نعیم الدین مرادابادی (۱۳۶۷ھ) مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
ردالمحتار علی الدر المختار، محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز عابدین دمشقی، حنفی (۱۲۵۲ھ)
رسائل ابن عابدین شامی، مؤسسۃ فؤاد بعینو للتجلید، بیروت
سیر اعلام النبلاء، شمس الدین ابوعبداللہ محمد ذہبی (۷۴۸ھ) مؤسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۵ھ
سنن ابن ماجہ، أبوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۷۳ھ) دار إحیاء الکتب العربیۃ
سنن ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث بن اسحاق سجستانی (۲۷۵ھ) المکتبۃ العصریۃ
سنن الترمذی، محمد بن عیسی بن سَوْرۃ، ترمذی، ابوعیسی (۲۷۹ھ) مصطفی البابی، مصر ۱۳۹۵ھ
سنن دارقطنی، ابوالحسن علی بن عمر بن احمد دارقطنی (۳۸۵ھ) مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۴ء
سنن کبری، احمد بن الحسین بن علی بن موسی ابوبکر بیہقی، مکتبۃ دارالباز۔مکۃ، ۱۹۹۴ء
سیرۃ ومناقب امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز، ابن جوزی (۵۹۷ھ) مکتبۃ الصفا، ۱۴۲۷ھ
شرح صحیح مسلم = المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج
شرح صحیح مسلم، غلام رسول سعیدی (۱۴۳۷ھ) مرکز اہل سنت برکات رضا، پور بندر گجرات
شرح عقود رسم المفتی، محمد امین معروف بہ ابن عابدین شامی، مکتبہ زکریا، دیوبند
کشف الاسرار شرح اصول بزدوی، علاء الدین بخاری حنفی (۷۳۰ھ)، دارالکتاب الاسلامی

صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ بخاری (۲۵۶ھ) دارطوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ
صحیح مسلم، مسلم بن الحجاج ابوالحسن نیساپوری (۲۶۱ھ) داراحیاء التراث العربی - بیروت
صور من حیاۃ التابعین، ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا، دارالادب الاسلامی ۱۴۱۸ھ
عمدۃ القاری شرح البخاری، بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) داراحیاء التراث العربی - بیروت
فتاوی رضویہ، احمد رضا خان بریلوی (۱۳۴۰ھ) مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات
فتح الباری شرح صحیح البخاری، احمد بن علی بن حجر عسقلانی، دارالمعرفۃ، بیروت ۱۳۷۹ھ
مبسوط، محمد بن الحسن شیبانی (۱۸۹ھ) ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی
مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ابوالحسن نورالدین علی ہیثمی (۸۰۷ھ) مکتبۃ القدسی، القاہرۃ ۱۴۱۴ھ
مجمع السلوک والفوائد، مخدوم شیخ سعد خیرآبادی (۹۲۲ھ) شاہ صفی اکیڈمی ۱۴۳۸ھ
مسند الامام احمد بن حنبل، ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل (۲۴۱ھ) مؤسسۃ الرسالۃ ۱۴۲۱ھ
مصنف ابن ابی شیبۃ، ابوبکر، عبداللہ بن محمد عبسی (۲۳۵ھ) مکتبۃ الرشد، الریاض، ۱۴۰۹ء
مصنف عبدالرزاق، ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ء
معجم کبیر، سلیمان بن احمد ابوالقاسم طبرانی (۳۶۰ھ) مکتبۃ العلوم والحکم، الموصل، ۱۹۸۳ء
موطا امام مالک، ابن انس (۱۷۹ھ) داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۰۶ھ
نورالایضاح، حسن بن عمار بن علی شرنبلالی مصری، حنفی (۱۰۶۹) المکتبۃ العصریۃ